اسلامی عبادات پر

ایک تحقیقی نظر

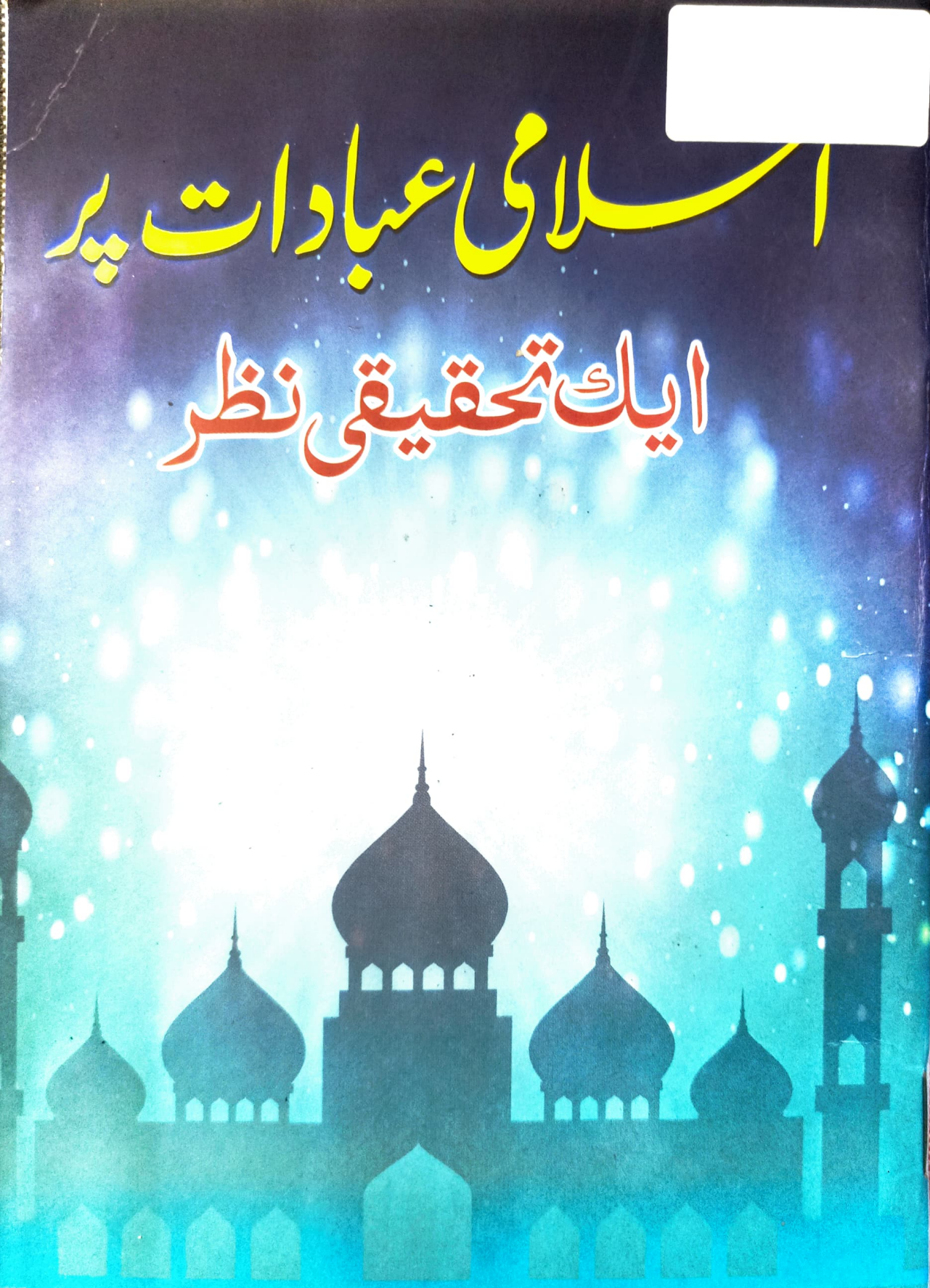

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب

حقیقت عبادت ۷

عبادت کا جاہلی تصور ۷

عبادت کا جوگیانہ تصور ۸

عبادت کا اسلامی تصور ۸

روحانی ارتقاء اور خدا کی یافت کا راستہ ۱۲

اسلام میں مراسم عبادات کی کیا حیثیت ہے۔ ۱۳

نماز ۱۵

یاددہانی ۱۵

فرض شناسی ۱۶

تعمیر سیرت ۲۰

ضبط نفس ۲۹

افراد کی تیاری کا پروگرام ۳۲

تنظیم جماعت ۳۳

نماز باجماعت ۳۴

اذان ۳۵

مسجد میں اجتماع ۳۶

صف بندی ۳۷

اجتماعی دعائیں ۳۸
امامت ۳۹
روزہ ۴۳
روزہ کے اثرات ۴۴
احساس بندگی ۴۴
اطاعت امر ۴۶
تعمیر سیرت ۵۳
ضبط نفس ۵۸
انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ ۶۴
روزے کا اجتماعی پہلو ۶۶
تقوے کی فضا ۶۷
اجتماعی احساس ۷۰
امداد باہمی کی روح ۷۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

جس موضوع پر اس رسالہ میں گفتگو کی گئی ہے اس پر اس سے پہلے میں اپنے خطبات میں بھی روشنی ڈال چکا ہوں۔ لیکن وہاں میرے مخاطب عوام تھے جو زیادہ گہرے معانی کا ادراک نہ کر سکتے تھے اس لیے مجھے بہت سادہ مطالب تک گفتگو محدود رکھنی پڑی تھی۔ اس کے بعد میں نے ضرورت محسوس کی کہ تعلیم یافتہ اور صاحب فکر و نظر اصحاب کے لیے اسی موضوع پر ایک مستقل مقالہ لکھوں تاکہ عبادت کی نسبت زیادہ عمیق معانی ان کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اگرچہ ان میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے اور اس میں ان تمام حقیقتوں کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے جو عبادت میں پوشیدہ ہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ جو کچھ اس میں عرض کیا گیا ہے وہ اکثر اہل علم کے عقلی اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔

سر دست صرف نماز اور روزے کے متعلق میرے دو مقالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ ابھی زکوٰۃ اور حج پر گفتگو باقی ہے لیکن اس کے لیے فرصت کا انتظار ہے اور احباب کا تقاضا ہے کہ جو کچھ لکھا جا چکا ہے اسے جو کچھ لکھا جانا ہے اس کے انتظار میں روک نہ رکھا جائے اس لیے یہ صفحات اس رسالہ کے حصہ اول کی حیثیت سے نذر ناظرین ہیں۔

ابوالاعلیٰ

حقیقت عبادت

قرآن کی رو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے:

وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ O (الذاریات:۵۶)

’’میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انس کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں‘‘۔

انبیاء علیہم السلام جس غرض سے دنیا میں بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انسان کو خدا کی عبادت کی طرف دعوت دیں:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

’’یہ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور رہو۔‘‘

پس ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ عبادت سے مراد کیا ہے اور اسلام میں جو عبادات ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے۔ اگر ان امور کو ہم نہ جانیں گے تو اس مقصد کو ہی پورا کرنے میں قاصر رہ جائیں گے، جس کے لیے ہم کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادت کا جاہلی تصور

اسلام میں عبادت کا مفہوم پوجا (WORSHIP) ہی کا نہیں ہے بلکہ بندگی (OBEDIANCE) کا بھی ہے۔ عبادت کو محض پوجا کے معنی میں لینا دراصل جاہلیت کا تصور ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسان پر قیاس کرتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے پسیج جاتے ہیں، اور ان سے یونہی کام نکلا جا سکتا ہے، اسی طرح ان کا معبود بھی انسان سے خوشامد، نذر و نیاز اور اظہار عاجزی کا طالب ہے۔ ان ہی تدبیروں سے اس

کو اپنے حال پر مہربان کرایا جاسکتا ہے اور اس کو خوش کر کے کام نکالا جاسکتا ہے، اس تصور کی بنا پر جاہلی مذاہب چند مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا جوگیانہ تصور

اسی طرح اسلام میں عبادت کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی دنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے۔ مراقبہ (MEDIATION)، نفس کشی (SELF ANNIHILATION) اور مجاہدات و عبادات (SPIRITUAL EXERCISES) کے ذریعہ اپنی اندرونی قوتوں کو نشو و نما دے، کشف و کرامت کی قوتیں اپنے اندر پیدا کرے اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرے، اخروی نجات حاصل کرے۔ عبادات کا یہ تصور ان مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور پر ہے، جو اس دنیا کو انسان کے لیے قید خانہ اور جسم کو روح کے لیے قفس سمجھتے ہیں۔ جن کے نزدیک دین داری اور دنیاداری ایک دوسرے کی ضد ہیں، جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے تعلقات سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں، جن کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے مادی انحطاط یا مادیات سے بے تعلقی ناگزیر ہے۔

عبادت کا اسلامی تصور

اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے، اس کا خالق، اس کا رازق، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اس کو اپنا خلیفہ مامور کیا ہے۔ یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کیے ہیں، کچھ ذمہ داریاں اور کچھ خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیت کے ایک حصہ پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے، اس کا کام یہاں اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے، آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے، اپنے اختیارات کو اور اپنی قوتوں کو حاکم اصلی کے قانون اور اس کی رضا کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ جس قدر زیادہ سرگرمی و جانفشانی کے ساتھ وہ زمین کی زندگی میں اپنی ذمہ داریوں اور اپنی متعلقہ خدمات کو بجالائے گا اور جتنی وفاداری اور فرماں برداری کے ساتھ اپنے اختیارات کے استعمال میں مالک کے قانون کی پیروی کرے گا اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔ اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی ماموریت کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ

مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہوتو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناص اور مطیع وفرماں بردار بندہ تھا نہ یہ کہ سست کام چور و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور جو ابتدا میں بیان کیے گئے ہیں غلط اور قطعی غلط ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے کے لیے الگ کرتا ہے وہ اس تھوڑے سے میں عبادت کے چند مخصوص مراسم ادا کر دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ میں نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے، اب میں آزاد ہوں کہ اپنی زندگی کے معاملات کو جس طرح چاہوں انجام دوں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ملازم جسے آپ نے رات دن کے لیے نوکر رکھا ہو اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں وہ بس صبح وشام آ کر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جہاں چاہے کھیلتا رہے یا جس جس کی چاہے نوکری بجالائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت نمازیں پڑھنے اور تسبیح پھرانے میں صرف کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے اور باغبانی سے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں اس کو نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ بس پڑھتا ہی رہے۔ ان کے مطابق باغ کی اصلاح وترقی کے لیے کام بھی نہ کر کے دے، ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام کی بھی ایسے عبادت گزاروں کے متعلق ہے اور جو برتاؤ اس قسم کے ملازموں کے ساتھ آپ کریں گے وہی برتاؤ ان غلط تصورات کے تحت عبادت کرنے والوں کے ساتھ خدا بھی کرے گا۔

اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو، آپ اپنے کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم (WHOLE TIME SERVANT) سمجھیں، آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں، آپ کا سونا اور جاگنا، کھانا اور پینا، آپ کا چلنا اور پھرنا، غرض سب کچھ خدا کے قانون[1] شرعی کی پابندی

---

[1] موجودہ زمانہ میں ایک صاحب نے قانون شرعی (MORAL LAW) اور قانون طبیعی (PHYSICAL LAW) کے فرق کو نظر انداز کر کے گمراہیوں کا ایک عظیم الشان فتنہ کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک عبادت الٰہی قانون طبیعی کی پیروی کا نام ہے، قطع نظر اس کے کہ قانون شرعی کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ اس بنا پر وہ ان لوگوں کو بھی خدا کا عبادت گزار (بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں ہو، خدا نے جن تعلقات میں آپ کو باندھا ہے ان سب میں آپ بندھیں اور ان کو اس طریقہ سے جوڑیں یا توڑیں جس طرح خدا نے انہیں جوڑنے یا توڑنے کا حکم فرمایا ہے۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں اور دنیوی زندگی میں جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ سنبھالیں اور ان کو اس طریقہ سے ادا کریں، جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں اور یہ سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلوں میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ، برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔ جب آپ رات کے اندھیرے میں ہوں اور کوئی نافرمانی اس طرح کر سکتے ہوں کہ کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ کو یہ خیال رہے کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ جب آپ جنگل میں جا رہے ہوں اور وہاں کوئی جرم اس طرح کر سکتے ہوں کہ کسی پکڑنے والے اور کسی گواہی دینے والے کا کھٹکا نہ ہو اس وقت بھی آپ خدا کو یاد کر کے ڈر جائیں اور جرم سے باز رہیں۔ جب آپ جھوٹ، بے ایمانی اور ظلم سے بہت سا فائدہ حاصل کر سکتے ہوں اور کوئی آپ کو روکنے والا نہ ہو، اس وقت بھی آپ خدا سے ڈریں اور فائدے کو اس لیے چھوڑ دیں

(بقیہ گزشتہ صفحہ کا) اور خلیفۂ الٰہی اور صالح و مومن قرار دیتے ہیں جو قانون طبیعی کے ماتحت تنظیم اور سائنٹفک ایجادات کے ذریعہ سے طاقت بہم پہنچائیں اگرچہ اس طاقت سے کام لینے میں خدا کے قانون شرعی کے پابند نہ ہوں۔ یہ ایسی زبردست غلطی ہے جس نے کفر کو عین اسلام، بغاوت کو عین عبادت اور معصیت کو عین طاعت بنا کر رکھ دیا ہے اور اسلام کے مشن کی اصلی روح ہی کو مسخ کر ڈالا ہے۔ ان صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کے آنے کا تو بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ آدمی کو قانون طبیعی سے قانون شرعی کے تحت کام لینے کی تعلیم دے، اگر انسان محض قانون طبیعی کے تحت عمل کرنے کے لیے ہوتا تو اس چیز کی تعلیم دینے کے لیے کسی نبی اور کسی کتاب کے آنے کی ضرورت نہ تھی اس کے لیے تو حیوانی جبلت ہی کافی تھی۔ اگر آدمی کا کام محض قانون طبیعی پر عمل کرنا ہی ہو تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جس طرح بھیڑیا بکریاں پھاڑ کھاتا ہے اور یہ اس کے لیے قانون طبیعی ہے اسی طرح ایک آدمی اگر دوسرے آدمی سے زیادہ طاقت رکھتا ہے اور اس کو پھاڑ کھاتا ہے تو یہ اس کے لیے بھی قانون طبیعی ہے۔ ایک قوم اگر دوسری قوم سے زیادہ ہوائی جہاز اور بم بنا سکتی ہے اور اس طاقت سے کام لے کر اسے اپنا خدا بنا لیتی ہے تو یہ بھی اس کے لیے قانون طبیعی ہے۔ یہ نظریہ انسانوں کو انسانیت کے درجہ سے گرا کر درندوں اور موذی جانوروں کے مرتبہ میں پہنچا دیتا ہے اور اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہے کہ انسان کی اس حیوانیت کو خدا کی عبادت قرار دے۔

کہ خدا اس سے ناراض ہوگا اور جب سچائی اور ایمان داری میں سراسر آپ کو نقصان پہنچتا ہو، اس وقت بھی آپ نقصان اٹھانا قبول کر لیں صرف اس لیے کہ خدا اس سے خوش ہوگا۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور اللہ اللہ کرنا عبادت نہیں ہے بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں پھنسو اور پھر خدا سے غافل نہ ہو۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے لیے بے شمار مواقع، بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں وہاں خدا کو یاد کرو اور اس کے قانون کی پیروی پر قائم رہو۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھو اور وہاں یاد رکھو کہ میں بندوں کا خدا نہیں ہوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہو اور وہاں ظلم پر قادر ہونے کے باوجود خیال رکھو کہ خدا کی طرف سے میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہو اور پھر یاد رکھو کہ میں خزانوں کا مالک نہیں بلکہ امین ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصلی مالک کو دینا ہے، فوجوں کے کمانڈر بنو اور خوف خدا تمہیں طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے۔ سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لو اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے مستقل اصولوں پر عمل کر کے دکھاؤ۔ تجارت، مالیات اور صنعت کی باگیں سنبھالو، اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلو، ایک ایک قدم پر حرام تمہارے سامنے ہزاروں خوب صورتیوں کے ساتھ آئے اور پھر تمہاری رفتار میں لغزش نہ آنے پائے۔ ہر طرف ظلم اور جھوٹ اور دغا اور فریب اور بدکاری کے راستے تمہارے سامنے کھلے ہوئے ہوں اور دنیوی کامیابیاں اور مادی لذتیں ہر راستے کے سرے پر جگمگاتے ہوئے تاج پہنے کھڑی نظر آئیں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف تمہارے لیے زنجیر پا بن جائے۔ حدود اللہ میں سے ایک حد کے قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے اور خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہو جائے پھر بھی تمہارا ارادہ متزلزل نہ ہو اور تمہاری جبین عزم پر شکن تک نہ آنے پائے۔ یہ ہے اصلی عبادت، اس کا نام ہے یاد خدا، اسی کو ذکر الٰہی کہتے ہیں اور یہی وہ ذکر ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْراً لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (الجمعہ:۱۰)

''پس جب نماز ختم ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کرو تا کہ تم فلاح یاب ہو سکو۔''

روحانی ارتقاء اور خدا کی یافت کا راستہ

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا عزلت کے گوشوں میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان دنیوی زندگی کے ہنگامۂ کارزار میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ وہ گویا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جس کے سامنے حرام کے فائدے، ظلم کے مواقع اور بدکاری کے راستے قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اسے خدا کی یافت ہو گئی۔ ہر قدم پر وہ اپنے خدا کو پا تا رہا بلکہ آنکھوں سے دیکھتا رہا، نہ پاتا اور نہ دیکھتا تو اس دشوار گھاٹی سے بخیریت کیوں کر گزر سکتا ہے؟ جس نے گھر میں، بازار میں، تفریح کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنگاموں میں ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے اس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے سے قریب اور بہت قریب پایا۔ جس نے سیاست و حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات و صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کا پابند رہا، اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اگر وہ خدا کا ولی اور مقرب بندہ نہ ہو گا تو اور کون ہو گا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشو و نما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام نہیں ہے کہ آپ پہلوان کی طرح ورزشیں کر کے اپنی قوت ارادی (WILL POWER) کو بڑھا لیں، اور اس کے زور سے کشف و کرامت کا مظاہرہ کرنے لگیں بلکہ روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے جسم اور ذہن کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں، دنیوی زندگی میں جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں اگر آپ شیطانی اور حیوانی طریق کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور صحیح تمیز کے ساتھ اس طرح پر ثابت قدم رہیں جو انسان کے شایان شان ہے

تو آپ کی انسانیت یوماً فیوماً ترقی کرتی چلی جائے گی اور آپ روز بروز خدا سے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے سوا روحانی ترقی اور کسی چیز کا نام نہیں[1]۔

اسلام میں مراسم عبادات کی کیا حیثیت ہے

یہ خلاصہ ہے اسلامی تصور عبادت کا، اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے اس کا عبد، یعنی بندہ بن کر رہے اور بندہ بن کر رہنے ہی کا نام عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ بہت چھوٹی سی بات ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ اسے زبان سے ادا کر دیا جا سکتا ہے مگر عملاً آدمی کی ساری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں، اس کے لیے بڑی زبردست ٹریننگ کی ضرورت ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مضبوط کیریکٹر پیدا کیا جائے، عادات اور خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر لیا جائے بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو، جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو، یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان کو عبادت کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہی عبادت ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصل عبادت کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہیں، یہ اس کے لیے لازمی ٹریننگ کورس ہیں۔ انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس خاص کیریکٹر کی تشکیل ہوتی ہے، منظّم عادات و خصائل کا پختہ سانچہ بنتا ہے اور اس

---

[1] اکثر لوگ روحانی ترقی کا لفظ بولتے ہیں مگر خود نہیں جانتے کہ ''روحانیت'' آخر ہے کیا چیز اسی لیے وہ تمام عمر ایک مبہم چیز کی تلاش اور سعی فضول میں لگے رہتے ہیں اور ساری تگ و دو کے بعد بھی کچھ نہیں جانتے کہ کہاں پہنچنا تھا اور کہاں پہنچے۔ حالانکہ اگر اسی لفظ روحانیت پر غور کر لیں تو بات بالکل واضح ہو جائے، ظاہر ہے کہ اس لفظ روحانیت سے مراد انسانی روح ہے نہ کہ کوئی اور روح۔ پس روحانیت انسانیت ہی کا دوسرا نام ہوا انسان اپنی حیوانی خواہشات کی بندگی سے نکل کر کمال انسانیت کی طرف جتنی زیادہ پیش قدمی کرے گا اور اخلاق و اوصاف انسانی سے آراستہ ہو کر رضائے الٰہی کے بلند ترین نصب العین تک پہنچنے کی جتنی کامیاب سعی کرے گا اسی قدر روحانی ترقی اس کو حاصل ہوگی۔

اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الٰہی میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہوسکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکانؔ اسلام قرار دیا گیا ہے۔ یعنی وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی اور قائم رہتی ہے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا ہے۔

ؔ ان ہی صاحب نے جن کا ذکر اس سے پہلے حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔ کلمہ شہادت اور ان چاروں عبادتوں کے ارکان اسلام ہونے کا صاف انکار کر دیا ہے اور اس کی بجائے اپنی طرف سے اسلام کے دس ارکان تصنیف کیے ہیں۔ یہ صاحب جہل مرکب میں مبتلا ہیں۔ ان کو نہ اسلام سے کوئی واقفیت ہے نہ لفظ رکن کے معنی و مفہوم کو وہ جانتے ہیں، نہ انہیں یہ خبر ہے کہ پانچوں چیزیں کس حیثیت سے اسلام کی رکن قرار دی گئی ہیں؟ نہ وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اگر یہ پانچوں چیزیں موجود نہ ہوں تو اسلام سرے سے کسی چیز کا نام ہی نہیں رہتا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر نے جن چیزوں کو ارکان اسلام قرار دیا ہے ان کو تو یہ حضرت فرماتے ہیں کہ ارکان اسلام نہیں ہیں اور خود انہوں نے جن دس باتوں کو تصنیف کیا ہے انہیں یہ ارکان اسلام قرار دیتے ہیں گویا آنجناب کے نزدیک اسلام اس دین کا نام نہیں ہے جسے خدا کے رسول نے پیش کیا تھا بلکہ جس چیز کو یہ کیمبرج کا رنیگر وضع کرے اس کا نام اسلام ہے۔ ایک طرف ان بزرگ کے یہ تطاولات ہیں اور دوسری طرف عام لوگوں میں علم کی کمی اور دنیا پرستی کی زیادتی کا یہ حال ہے کہ ایسے شخص کی قیادت میں جو تنظیم ہو اسے وہ اسلامی تنظیم اور اسلامی نظام امارت سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک امیر کے عقیدے اور علم دین اور اخلاق کو دیکھنے کی حاجت نہیں۔ نفس تنظیم اور نفس نظام امارت مقصود بالذات ہے خواہ عمر فاروقؓ کے تحت ہو، خواہ ہٹلر یا مسولینی کے تحت ہی میسر آجائے۔ خدا کی پناہ اس دور کے فتنے کس حد تک پہنچ رہے ہیں۔

نماز

یاددہانی

انسان کی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں اس بات کا شعور ہر وقت تازہ، ہر وقت زندہ، ہر وقت کارفرما رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اسے دنیا میں سب کچھ بندہ ہونے کی حیثیت سے ہی کرنا ہے۔ اس شعور کو بار بار ابھارنے اور تازہ کرنے کی ضرورت اس لیے لاحق ہوتی ہے کہ درحقیقت وہ جس کا بندہ ہے وہ تو اس کی آنکھوں سے اوجھل اور اس کے حواس سے دور ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک شیطان خود آدمی کے اپنے نفس میں موجود ہے جو ہر وقت کہتا رہتا ہے کہ تو میرا بندہ ہے اور لاکھوں کروڑوں شیطان ہر طرف دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دعویٰ کر رہا ہے کہ تو میرا بندہ ہے۔ یہ شیاطین، آدمی کو محسوس ہوتے ہیں، نظر آتے ہیں اور ہر آن نت نئے طریقوں سے اپنی طاقت اس کو محسوس کراتے رہتے ہیں۔ ان دوگونہ اسباب سے یہ شعور کہ میں خدا کا بندہ ہوں اور اس کے سوا مجھے کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے آدمی کے ذہن سے گم ہو جاتا ہے۔ اس کو زندہ اور کارفرما رکھنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا زبان سے اقرار کر لے یا محض ایک علمی فارمولے کی حیثیت سے اس کو سمجھ لے، بلکہ اس کے لیے قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے بار بار ابھارا اور تازہ کیا جائے۔ یہی کام نماز کرتی ہے۔ صبح اٹھتے ہی سب کاموں سے پہلے وہ آپ کو یہی یاد دلاتی ہے۔ پھر جب آپ دن کو کام کاج میں مشغول ہوتے ہیں تو ہنگامہ سعی و عمل کے دوران میں دو دفعہ آپ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے الگ کھینچ بلاتی ہے تاکہ احساس بندگی کا نقش اگر دھندلا ہو گیا ہو تو اسے تازہ کر دے۔ پھر شام

کو جب تفریحوں اور دل چسپیوں کا وقت آتا ہے تو پھر یہ آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطان نفس کے بندے نہیں ہو۔ اس کے بعد رات آتی ہے، وہ رات جسے اندر کا شیطان اور باہر کے شیاطین سب مل کر معصیتوں سے سیاہ کر دینے کے لیے دن بھر میں منتظر رہتے ہیں، نماز پھر سامنے آ کر آپ کو خبردار کرتی ہے کہ تمہارا کام خدا کی بندگی کرنا ہے نہ کہ ان شیاطین کی۔

یہ نماز کا پہلا فائدہ ہے۔ اسی بنا پر اسے قرآن میں ذکر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اگر نماز میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تب بھی صرف یہی ایک صفت اس کو رکن اسلام قرار دینے کے لیے کافی تھی کیونکہ اس کے فائدے کی اہمیت پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنا ہی زیادہ اس امر کا یقین حاصل ہوتا ہے کہ آدمی کا عملاً بندۂ خدا بن کر رہنا اس یاد دہانی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

فرض شناسی

پھر چونکہ آپ کو اس زندگی میں ہر قدم پر خدا کے احکام بجالانے ہیں، خدا کی سپرد کی ہوئی خدمات اس کی مقرر کی ہوئی حدود کی نگہداشت کے ساتھ انجام دینی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ میں فرض شناسی پیدا ہو اور فرض کو مستعدی کے ساتھ اور فرماں برداری سے انجام دینے کی عادت آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ جو شخص یہ جانتا ہی نہ ہو کہ فرض کیا بلا ہوتی ہے اور اس کا فرض ہونا کیا معنی رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی ادائے فرض کے قابل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو شخص فرض کے معنی تو جانتا ہو مگر اس کی تربیت اتنی خراب ہو کہ فرض جاننے کے باوجود وہ اسے ادا کرنے کی پروا نہ کرے، اس کے کیریکٹر پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی عملی خدمت (ACTIVE SERVICE) کا اہل ہو سکتا ہے۔ پس یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جن لوگوں کو کسی ذمہ دارانہ خدمت پر مامور کیا جائے ان کے لیے فرض شناسی اور اطاعت امر کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہے کہ کام کے آدمی تیار ہوتے رہتے ہیں بلکہ اس کا فائدہ یہ بھی ہے کہ روز یہ فرق کھلتا رہتا ہے کہ جو لوگ خدمت کے امیدوار ہیں ان میں کون قابل اعتماد ہے اور کون نہیں ہے۔ تمام عملی خدمات کے لیے یہ قطعاً ضروری ہے کہ ہمیشہ بالالتزام عملی آزمائش (PRACTICAL TEST) پر آدمیوں کو پرکھا جاتا رہے تاکہ ناقابل اعتماد آدمی ملازمت میں نہ رہنے پائے۔

فوج کو دیکھئے، کن کن طریقوں سے وہاں ڈیوٹی کو سمجھنے اور اسے ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے، رات دن میں کئی کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے،

ان سے قواعد کرائی جاتی ہے، یہ سب کس لیے ہے؟ اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سپاہیوں کو حکم بجالانے کی عادت ہو، ان میں فرض شناسی کا مادہ پیدا ہو، ان میں ایک نظام اور تربیت کے لیے کام کرنے کی خصلت پیدا ہو، اور اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی آزمائش کی جاتی رہے، روزانہ یہ فرق کھلتا رہے کہ جو لوگ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں ان میں سے کون کام کے آدمی ہیں اور کون ناکارہ ہیں۔ جو سست اور ناکارہ لوگ بگل کی آواز سن کر گھر بیٹھے رہیں یا قواعد میں حکم کے مطابق حرکت نہ کریں انہیں پہلے ہی فوج سے نکال باہر کیا جاتا ہے کیونکہ ان پر یہ بھروسہ نہیں کیا جاسکتا کہ جب کام کا وقت آئے گا تو وہ فرض کی پکار پر لبیک کہیں گے۔

دنیوی فوجوں کے لیے تو کام کا وقت کبھی برسوں میں آتا ہے اور اس کے لیے یہ اہتمام ہے کہ روزانہ سپاہیوں کی تربیت اور ان کی آزمائش کی جاتی ہے مگر اسلام جو فوج بھرتی کرتا ہے اس کے لیے ہر وقت کام کا وقت ہے، وہ ہر وقت برسرکار (ON DUTY) ہے، اس کے لیے ہر وقت معرکۂ کارزار گرم ہے، اسے زندگی میں ہر آن، ہر لمحہ فرائض ادا کرنے ہیں، خدمات بجالانی ہیں، شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے اور احکام شاہی کو نافذ کرنا ہے۔ اسلام محض ایک اعتقادی مسلک نہیں ہے بلکہ عملی خدمت ہے اور عملی خدمت بھی ایسی جس میں رخصت، تعطیل، آرام کا کوئی وقت نہیں۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے پیہم اور مسلسل خدمت ہی خدمت ہے، اب فوج کی مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجئے کہ ایسی سخت عملی خدمت کے لیے کتنے سخت ڈسپلن، کیسی زبردست تربیت اور کتنی شدید آزمائش کی ضرورت ہے۔ محض عقیدہ (CREED) کا زبانی اقرار اس کے لیے کیوں کر کافی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اس فوج میں رکھ لیا جائے جس کو اتنی اہم خدمت انجام دینی ہے۔ عقیدہ کا اقرار تو صرف اس ملازمت میں داخل ہونے کے لیے امیدواری کا اعلان ہے اس اعلان کے بعد یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اسے ڈسپلن کے شکنجے میں کسا جائے۔ اس ڈسپلن میں رہ کر ہی وہ اسلام کے کام کا بن سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اس شکنجہ کی گرفت میں دینے کے لیے تیار نہیں۔ اگر وہ فرض کی پکار پر نہیں آتا۔ اگر وہ احکام کی اطاعت کے لیے کوئی مستعدی اپنے اندر نہیں رکھتا تو وہ اسلام کے لیے قطعی ناکارہ ہے۔ خدا کو اور اس کے دین کو ایسے فضول آدمی کی کوئی حاجت نہیں۔

یہی دو گونہ اغراض ہیں جن کے لیے نمازیں رات دن میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ روزانہ پانچ بار بگل بجاتی ہے تاکہ اللہ کے سپاہی اس کو سن کر ہر طرف سے دوڑے چلے آئیں

اور ثابت کریں کہ وہ فرض کو پہنچانتے ہیں، اللہ کے وفادار ہیں۔ اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے احکام بجالانے کے لیے مستعد ہیں۔ اس طریقہ سے ایک طرف سپاہیوں کی تربیت ہوتی ہے اور دوسری طرف مومن اور منافق کا فرق کھلتا رہتا ہے۔ جو لوگ اس آواز پر پابندی کے ساتھ آتے ہیں اور ضابطے کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ ان میں فرض شناسی، مستعدی، انضباط اور اطاعت امر کا مادہ نشوونما پاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اس آواز کو سن کر اپنی جگہ سے نہیں ہلتے وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ فرض کو پہچانتے نہیں یا پہچانتے ہیں تو اسے ادا کرنے کے لیے مستعد نہیں ہیں یا تو وہ اس اقتدار (AUTHORITY) ہی کو تسلیم نہیں کرتے جس نے اسے فرض قرار دیا ہے، یا پھر ان کی ذہنی حالت اتنی ناقص ہے کہ جسے اپنا الٰہ اور رب مانتے ہیں اس کے پہلے اور اہم ترین حکم کو بھی بجالانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو صادق الایمان (TRUE TO THEIR CONVICTION) نہیں ہیں۔ ان میں یہ صفت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ جس چیز کو حق جانیں اس کے مطابق عمل کرنے کی زحمت بھی اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ پہلی صورت میں وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اور دوسری صورت میں وہ اتنے نالائق اور ناکارہ ہیں کہ اسلامی جماعت میں رہنے کے قابل نہیں۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ:

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ○ (البقرہ:۴۵)

''بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے، سوائے خاشعین کے۔''

یعنی جو لوگ خدا سے ڈرتے ہوئے اس کی اطاعت و بندگی کے لیے تیار نہیں صرف انہی پر نماز گراں گزرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جس پر نماز گراں گزرے وہ خود اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی و اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ط

(التوبہ:۱۱)

''اگر وہ (کفر و شرک سے) توبہ کریں اور نماز کے پابند ہوں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

یعنی نماز کے بغیر آدمی اسلام کی دینی برادری میں شامل نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ○ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ○ (البقرہ:۲،۳)

''یہ (کتاب) صرف ان خداترس لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو ان دیکھی حقیقت پر ایمان لائیں اور نماز کے پابند ہوں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے راہ خدا میں خرچ کریں۔''

اسی بنا پر منافقین کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ۙ (النساء:۱۴۲)

''جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے اٹھتے ہیں۔''

یعنی وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو اس طرح کسمساتے ہوئے بادل ناخواستہ اٹھتے ہیں کہ گویا ان کی جان پر بن رہی ہے۔ اور

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ○ (الماعون:۵)

''جو اپنی نمازوں سے غافل ہوتے ہیں۔''

اسی بنا پر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ:

بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ۔

''بندے اور کفر کے درمیان صلٰوۃ واسطہ ہے۔''

یعنی ترک صلوۃ وہ پل ہے جس کو عبور کر کے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔ اسی بنا پر رحمۃ للعلمین نے فرمایا کہ ''جو لوگ اذان کی آواز سن کر گھروں سے نہیں نکلتے، میرا جی چاہتا ہے کہ جا کر ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔'' اور اسی بنا پر فرمایا:

العهد بيننا وبينهم الصلوة فمن تركها فقد كفر۔

''ہمارے اور عرب کے بدؤوں کے درمیان تعلق کی بنا نماز ہے۔ جس نے اسے چھوڑ دیا وہ کافر قرار پائے گا اور اس سے ہمارا تعلق ٹوٹ جائے گا۔''

آج دین سے قطعی ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، جو اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے، جن کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ مؤذن کس کو بلا رہا ہے اور کس کام کے لیے بلا رہا ہے وہ بھی مسلمان سمجھے جاتے ہیں اور یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ نماز کی کوئی خاص اہمیت

اسلام میں نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی آدمی مسلمان ہوسکتا ہے بلکہ مسلمانوں کا امام اور ملت کا قائد بھی ہوسکتا ہے۔ اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ تھا۔ اس وقت یہ حال نہ تھا۔ مستند روایت ہے کہ:

كان اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم لايرون شيئا من الاعمال تركه كفرا غير الصلوة۔

''یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں یہ بات متفق علیہ تھی کہ اسلامی اعمال میں سے صرف نماز ہی وہ عمل ہے جس کو چھوڑ دینا کفر ہے۔''

تعمیر سیرت

نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے یا بالفاظ دیگر زندگی کو خدا کی عبادت بنا دینے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ آپ دیکھتے ہیں کہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے، جیسے مقاصد اس کے پیش نظر ہوتے ہیں ان ہی کے لحاظ سے سیرت بنانے کے لیے ایک نظام تربیت وضع کیا جاتا ہے۔ مثلاً سلطنتوں کی سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے اس لیے سول سروس کی ٹریننگ میں تمام تر زور حکومت مقتدرہ کی وفاداری اور نظم مملکت (ADMINISTRATION) کی صلاحیتیں پیدا کرنے ہی پر صرف کیا جاتا ہے، تقویٰ اور طہارت کا وہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پرائیویٹ زندگی خواہ کتنی ہی گندی کیوں نہ ہو، ایک شخص اس کے باجود سول سروس میں داخل ہوسکتا اور ترقی کرسکتا ہے۔ کیونکہ حکومت میں راستی اور حق کے اصولوں کی پابندی کرنا اور اخلاق کو سیاست کی بنیاد بنانا وہاں سرے سے پیش نظر نہیں ہے۔ اسی طرح فوجوں کی تنظیم کا مقصد جنگ کی قابلیت بہم پہنچانا ہوتا ہے اس لیے سپاہیوں کی تربیت محض اس نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے کہ انہیں مار دھاڑ کے لیے تیار ہونا ہے، انہیں پریڈ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ منظم صورت میں کام کرسکیں، انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے تاکہ کشت و خون کے فن میں ماہر ہوجائیں، ان کو اطاعت امر کا خوگر بنایا جاتا ہے تاکہ حکومت جہاں اور جس غرض کے لیے بھی ان کے دست و بازو سے کام لینا چاہے وہاں وہ بے تامل کام کریں۔ اس کے سوا کوئی بلند تر اخلاقی مقصد چونکہ پیش نظر ہی نہیں ہوتا اس لیے فوجوں کی سیرت میں تقویٰ پیدا کرنے کا خیال تک کسی کو نہیں آتا۔ سپاہی اگر ڈسپلن کے پابند ہیں تو حکومت کے مقصد کے لیے بس یہی کافی ہے اس کے بعد کچھ پرواہ نہیں، اگرچہ وہ زانی، شرابی، جھوٹے، بددیانت اور ظالم ہوں۔

اسلام اس کے برعکس ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جس کا مقصد اول نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے۔ جس کو سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ، بین الاقوامی تعلقات، غرض تمدن کے ہر شعبے میں اخلاق کے مستقل اصولوں کی پابندی کرنی ہے، جسے زمین پر خدا کے قانون کو نافذ کرنا ہے وہ اس کے لیے اپنے اہل کار سپاہی اور افسر ایک دوسرے نظام تربیت کے تحت تیار کرتا ہے تاکہ ان کے اندر وہ سیرت پیدا ہو جو اس خاص نوعیت کی خدمت سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس سیرت کی بنیاد اسلام کے ایمانیات ہیں۔ خدا کا خوف، اس کی محبت، اس کا عشق، اس کی خوشنودی کو مقصد زندگی قرار دینا، اس کو حاکم اصلی سمجھنا، اس کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ خیال کرنا، اور یہ جاننا کہ ایک روز وہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ یہی وہ اساسی تصورات ہیں جن پر اسلامی سیرت کی بنا قائم ہوتی ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر وقت، ہر جگہ، ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے، اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے، اس کے دماغ میں جو خیالات اور ارادے پیدا ہوتے ہیں ان سے بھی وہ ناواقف نہیں، تمام دنیا سے چھپ جانا ممکن ہے مگر خدا سے چھپنا غیر ممکن، تمام دنیا کی سزاؤں سے آدمی بچ سکتا ہے مگر خدا کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔ دنیا میں نیکی ضائع ہو سکتی ہے بلکہ نیکی کا بدلہ بدی کی صورت میں بھی مل سکتا ہے مگر خدا کے ہاں یہ ممکن نہیں۔ دنیا کی نعمتیں محدود ہیں مگر خدا کی نعمتیں بے حد و حساب ہیں، دنیا کا نفع و نقصان فانی اور آنی ہے مگر خدا کے ہاں جو نفع یا نقصان ہے وہ پائیدار ہے۔ یہی یقین آدمی کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے۔ اسی اعتقاد کے زور سے وہ حلال و حرام کی ان حدود کا لحاظ رکھنے پر آمادہ ہوتا ہے جو خدا نے زندگی کے معاملات میں قائم کی ہیں۔ یہی چیز اسے خواہشات کی بندگی سے، ناجائز منفعتوں اور لذتوں کے لالچ سے اور بداخلاقی کے مفید مطلب ذرائع اختیار کرنے سے روکتی ہے۔ اسی عقیدے میں یہ طاقت ہے کہ آدمی کو عدل، صداقت، حق شناسی و حق پرستی اور مکارم اخلاق کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھنے اور اسے دنیا کی اصلاح کے اس کٹھن کام پر اٹھنے کے لیے آمادہ کرے، جس کی دشواریوں اور ذمہ داریوں کا تصور بھی کوئی غیر مومن انسان برداشت نہیں کر سکتا۔

نماز وہ چیز ہے جو ان تصورات کو بار بار تازہ کرتی ہے اور ذہن میں گہری جڑوں کے ساتھ بٹھاتی رہتی ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ

ہی اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور پھر ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے کچھ اس طور سے رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود آدمی کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

دیکھئے نماز کا ارادہ کرتے ہی سب سے پہلے آپ اپنا جائزہ لیتے ہیں کہ ناپاک تو نہیں ہیں؟ کپڑے تو نجس نہیں ہیں؟ وضو ہے یا نہیں؟ غور کیجئے یہ خیال آپ کو کیوں آتا ہے؟ اگر آپ نجس حالت میں نماز کے لیے کھڑے ہوں یا بے وضو کھڑے ہو جائیں تو کون آپ کو پکڑ سکتا ہے؟ کس کو آپ کے حال کی خبر ہو سکتی ہے؟ پھر آپ ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ کو خدا کا خوف ہے، اس بات کا یقین ہے کہ اس سے کوئی راز نہیں چھپ سکتا اور اس پر ایمان ہے کہ آخرت میں اس فعل کا جواب دینا پڑے گا۔ یہی چیز آپ سے طہارت اور وضو کے ان تمام قواعد وضوابط کی پابندی کراتی ہے جو نماز کے لیے مقرر کیے گئے ہیں ورنہ کوئی دنیوی طاقت ایسی موجود نہیں ہے، جو آپ سے ان کی پابندی کرانے والی ہو۔

اس کے بعد آپ نماز شروع کرتے ہیں۔ یہاں آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قیام وقعود اور رکوع وسجود کی حالتوں میں قرآن کی آیات یا دعائیں یا تسبیحیں جس جس طرح پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح ان کو پڑھیں، آخر یہ پابندی آپ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ساری چیزیں تو آہستہ پڑھی جاتی ہیں۔ اگر آپ نہ پڑھیں یا ان کی جگہ کچھ اور پڑھ دیں یا ان میں کچھ اپنی طرف سے الٹی سیدھی باتیں ملا دیں تو کسی کو بھی آپ کے اس فعل کی خبر نہیں ہو سکتی۔ پھر بتائیے کس کا خوف، کس کے واقف اسرار ہونے کا یقین اور کس کی جزا وسزا پر ایمان آپ کو ٹھیک ٹھیک نماز ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

نماز کے اوقات آپ پر مختلف حالتوں میں آتے ہیں۔ کبھی آپ جنگل میں ہوتے ہیں، کبھی رات کے اندھیرے میں، کبھی گھر کی تنہائی میں، کبھی اپنی دلچسپ تفریحوں میں مشغول ہوتے ہیں اور کبھی اپنے کاروبار میں منہمک، کبھی سردی کی شدت لحاف سے سر نکالنے تک کی اجازت نہیں دیتی اور کبھی چلچلاتی دھوپ گھر سے قدم نکالتے ہی بھون ڈالنے پر آمادہ ہوتی ہے۔ غرض اس طرح کی بے شمار مختلف حالتیں آپ پر رات دن آتی رہتی ہیں۔ ان سب حالتوں میں کون سی طاقت آپ کو نماز کی طرف کھینچ لے جاتی ہے؟ اگر وہ خدا پر ایمان، اس کے سمیع وعلیم ہونے کا یقین، اس کی ناراضی کا خوف اور اس کی رضا کی طلب نہیں تو اور کیا ہے؟ ضروری نہیں کہ یہ سب تصورات آپ کے شعور جلی ہی میں تازہ رہیں۔ سیرت دراصل ان تصورات سے بنتی ہے جو شعور خفی میں پیوستہ

ہوتے ہیں۔ شعور کی گہرائی میں جو تصور اتر جاتا ہے وہی حقیقت میں مستحکم ہوتا ہے اور اسی سے مستقل خصائل اور اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

اب ذرا ان چیزوں پر ایک نظر ڈالیے جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان میں اول سے لے کر آخر تک ایک ایک نقطہ ایسا ہے جو اسلام کے بنیادی تصورات اور اس کی اسپرٹ سے لبریز ہے۔ ان مضامین کو بار بار پڑھنے سے وہ تمام ایمانیات بار بار تازہ اور ذہن نشین ہوتے رہتے ہیں جن پر اسلامی سیرت کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے اذان کو لیجئے۔ روزانہ پانچ وقت آپ کو کن الفاظ میں نماز کی اطلاع دی جاتی ہے:

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ	خدا سب سے بڑا ہے، خدا سب سے بڑا ہے
اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی بندگی کی جائے۔
اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ	میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔
حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ	آؤ نماز کے لیے۔
حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ	آؤ اس کام کے لیے جس میں فلاح و بہبودی ہے۔
اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ	اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

دیکھو! یہ کیسی زبردست پکار ہے؟ ہر روز پانچ مرتبہ یہ آواز کس طرح تمہیں یاد دلاتی ہے کہ زمین میں جتنے خدائی دعویدار پھر رہے ہیں یہ سب جھوٹے ہیں، زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کے لیے بڑائی ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ آؤ اس کی عبادت کرو، اسی کی عبادت میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے، کون ہے جو اس آواز کو سن کر ہل نہ جائے گا؟ کیوں کر ممکن ہے کہ جس کے دل میں ایمان ہو وہ اتنی بڑی بات کی گواہی اور ایسی زبردست پکار کو سن کر اپنی جگہ بیٹھا رہ جائے اور اپنے مالک کے آگے سر جھکانے کے لیے دوڑ نہ پڑے؟

اس کے بعد تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو۔ منہ قبلہ کے سامنے ہے، پاک وصاف ہو کر بادشاہ عالم کے دربار میں حاضر ہو۔ سب سے پہلے تمہاری زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف پھیر دیا جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا ہے اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خدائی میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

اس دوٹوک بات کا اقرار کر کے تم کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہو، گویا دنیا و مافیہا سے دست بردار ہو رہے ہو[1]۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیتے ہو[2]۔ گویا اب تم بالکل اپنے بادشاہ کے سامنے مؤدب دست بستہ کھڑے ہو، اس کے بعد تم کیا عرض معروض کرتے ہو؟ یہ کہ:

سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ۔

پاک[3] ہے تو اے خدا! تعریف و ستائش ہے تیرے لیے۔ برکت والا ہے تیرا نام، سب سے بلند و بالا ہے تیری بزرگی اور کوئی معبود نہیں تیرے سوا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔

خدا کی پناہ مانگتا ہوں میں شیطان مردود کی دراندازی و شرارت سے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَo اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِo اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُo اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَo صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ o غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَo اٰمین

"تعریف خدا کے لیے ہے جو سارے جہان والوں کا رب ہے۔ نہایت رحم والا

---

[1] ہاتھ اٹھانا دراصل دو چیزوں کی علامت ہے۔ ایک تسلیم (SURRENDER) یعنی مزاحمت ترک کر کے اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ دوسرے دست برداری یعنی جن چیزوں سے آدمی اب تک تعلق رکھتا تھا ان سے اس نے ہاتھ اٹھا لیا۔

[2] کسی کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا انتہائی ادب و احترام اور غلامانہ نیازمندی کا اظہار ہے اسی لیے قدیم ترین زمانہ سے بادشاہوں نے اپنے درباری آداب میں اسے شامل کیا ہے لیکن اسلام اسے صرف دربار الٰہی کی حاضری کے لیے خاص کرتا ہے۔

[3] پاک ہے یعنی عیب، نقص، کمزوری اور غلطی سے پاک ہے اور تعریف و ستائش ہے تیرے لیے یعنی تو تمام کمالات اور تمام خوبیوں سے متصف ہے۔

اور بڑا مہربان ہے۔ روز جزا کا حاکم ہے۔ مالک! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے فضل وانعام فرمایا ہے۔ جن سے تو ناراض نہیں ہے اور جو راہ راست سے بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ خدایا ایسا ہی ہو، مالک ہماری اس دعا کو قبول کر۔''

اس کے بعد تم قرآن کی کچھ آیتیں پڑھتے ہو۔ جن میں سے ہر ایک میں اسلام کے اساسی اصول، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی عملی ہدایات بیان کی گئی ہیں اور اس راہ راست کے نشانات دکھائے گئے ہیں جس کی رہنمائی کی درخواست ابھی اس سے پہلے تم نے کی ہے۔ مثلا:

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o

''زمانہ کی قسم (یعنی زمانہ اس بات پر گواہ ہے) کہ آدمی نقصان میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔ اور جو ایک دوسرے کو حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔''

ان مختصر جملوں میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ تو بربادی ونامرادی سے بچ نہیں سکتا۔ جب تک کہ خدا پرستی ونیک عملی اختیار نہ کرے۔ اور پھر انفرادی نیکی ہی کافی نہیں ہے بلکہ تیری فلاح کے لیے ناگزیر ہے کہ تیری سوسائٹی ایسی ہو جس میں حق پرستی کی روح کارفرما ہو۔ تیری اپنی تاریخ اس حقیقت پر گواہی دے رہی ہے۔ یا مثلا:

أَرَأَيْتَ الَّذِیْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ o فَذٰلِكَ الَّذِیْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ o وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ o فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ o وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ o

''تو نے دیکھا اس شخص کو جو روز جزا کو نہیں مانتا (وہ کیسا آدمی ہوتا ہے؟) ایسا ہی آدمی یتیم کو دھتکارتا ہے۔ اور مسکین کو آپ کھانا کھلانا تو درکنار دوسروں کو بھی یہ کہنا پسند نہیں کرتا کہ غریب کو کھانا کھلا دو۔ پھر افسوس ہے ان نمازیوں پر جو (آخرت کو نہ ماننے ہی کی وجہ سے) نماز سے غفلت کرتے ہیں اور پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے۔ اور ان کے دل ایسے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ذرا ذرا سی چیزیں حاجت مندوں کو دیتے ہوئے بھی ان کا دل دکھتا ہے۔''

ان چھوٹے چھوٹے پر اثر فقروں میں یہ بات ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخرت کا اعتقاد آدمی کی اخلاقی زندگی میں کیا اثر رکھتا ہے اور اس عقیدہ پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کا اجتماعی برتاؤ اور انفرادی رویہ کس طرح خلوص اور ہمدردی سے خالی ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗٓ أَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝

''تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ چکنا چور کر دینے والی جگہ؟ اللہ کی آگ خوب بھڑکائی ہوئی جو دلوں تک پہنچے گی وہ ان پر ڈھانک کر بند کر دی جائے گی (اس حال میں کہ وہ) اونچے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔''

یہ محض دو تین نمونے ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر نماز میں قرآن کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھنا کس لیے لازم کیا گیا ہے۔ اس سے غرض یہی ہے کہ روزانہ کئی کئی وقت خدا کے احکام، اس کی ہدایات اور اس کی تعلیمات بار بار آدمی کو یاد دلائی جاتی رہیں یہ دنیا، یہ دار العمل جس میں کام کرنے کے لیے انسان کو بھیجا گیا ہے اسی طرح درست رہ سکتی ہے کہ اس کے اندر کام کرنے کے دوران میں آدمی کو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد الگ بلایا جاتا ہے تاکہ یہاں جس قانون اور جس ہدایت نامہ کے مطابق اسے کام کرنا ہے اس کی دفعات اس کی یاد میں تازہ ہوتی رہیں۔

ان ہدایتوں کو پڑھنے کے بعد تم اللہ اکبر کہتے ہوئے رکوع میں جاتے ہو۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے بادشاہ کے آگے جھکتے ہو[1]۔ اور بار بار کہتے ہو:

سُبْحَانَ رَبِّىَ الْعَظِيْمِ — پاک ہے میرا رب جو بڑا بزرگ ہے۔

پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہو اور کہتے ہو:

---

[1] یہ رکوع اس تسلیم و سپردگی کی مزید ترقی ہے جس کی ابتداء نماز کے شروع میں ہاتھ اٹھا کر کی گئی تھی۔

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ اللہ نے سن لی اس شخص کی بات جس نے اس کی تعریف بیان کی۔

پھر اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہو[1]، اور بار بار کہتے ہو:

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پاک ہے میرا مالک جو سب سے بالا و برتر ہے۔

پھر اللہ اکبر کہہ کر سر اٹھاتے ہو، ادب سے بیٹھ جاتے ہو اور یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہو:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِیْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

''ہماری سلامیاں، ہماری نمازیں اور ہمارے اچھے کام اللہ کے لیے ہیں۔ سلام ہو آپ پر اے نبیؐ! اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں آپ پر نازل ہوں۔ سلامتی ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

یہ شہادت دیتے وقت سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھائی جاتی ہے کیونکہ یہ نماز میں مسلمان کے عقیدے کا اعلان ہے اور اس کو زبان سے ادا کرتے وقت خاص طور پر توجہ اور زور دینے کی ضرورت ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

''خدایا رحمت فرما محمدؐ پر اور آل محمد پر جس طرح تو نے رحمت فرمائی ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ پر۔ تو قابل تعریف اور صاحب عظمت ہے۔ خدایا برکت عطا فرما محمدؐ اور آل محمد کو جس طرح تو نے برکت دی ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ کو۔ تو قابل تعریف اور صاحب عظمت ہے۔''

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ

---

[1] اسی تسلیم و سپردگی کی تکمیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بندے نے اپنا وہ سر جس میں خودی اور خودسری اور انانیت و خود پرستی رہتی ہے خدا کے آگے زمین پر ٹیک دیا۔ اب سر میں خودمختاری کے سودے کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہا۔ بندہ اب پوری طرح اپنے خدا کا تابع فرمان ہے۔

فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ۔

''خدایا تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ کے عذاب سے اور پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں دجال کے فتنہ سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں زندگی وموت کے فتنہ سے اور تیری پناہ مانگتا ہوں برے اعمال سے اور دوسروں کے حقوق کی ذمہ داری سے۔''

یہ ہیں وہ عبارتیں جو رات دن کی پانچوں نمازوں میں بہ تکرار دہرائی جاتی ہیں مگر رات کو سونے سے پہلے سب سے آخری نماز کی آخری رکعت میں ایک اور دعا بڑھ جاتی ہے اس کا نام دعائے قنوت ہے۔ یہ ایک عظیم الشان اقرار نامہ ہے جو سکون کے لمحوں میں بندہ اپنے خدا کے سامنے پیش کرتا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَعِيْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْکَ وَنُثْنِیْ عَلَيْکَ الْخَيْرَ وَنَشْكُرُکَ وَلَا نَكْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ يَفْجُرُکَ اَللّٰهُمَّ اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْکَ نَسْعیٰ وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشیٰ عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِقٌ۔

''خدایا ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، تجھ پر ایمان لاتے ہیں، تیرے ہی اوپر بھروسہ کرتے ہیں اور تیری بہترین تعریف کرتے ہیں، ہم تیرا شکر ادا کریں گے۔ ناشکری نہیں کریں گے۔ جو تیری نافرمانی کرے گا ہم اسے چھوڑ دیں گے اور اس سے تعلق توڑ دیں گے۔ خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں، تیرے ہی لیے نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں، ہماری ساری کوششوں اور ساری دوڑ دھوپ کا مقصد تو ہے۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کہ یقیناً تیرا عذاب کفران نعمت کرنے والوں کو آئے گا۔''

یہ عبارتیں کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں ہیں۔ ہر شخص ان کے اندر خود دیکھ سکتا ہے کہ اسلام اپنی سول سروس اور اپنی فوج کی اور اپنی سوسائٹی کے ہر فرد کی کن جذبات، کن ارادوں اور کن نیتوں کے ساتھ تربیت کرتا ہے، کون سے خیالات ان کے دل میں بٹھاتا ہے اور کس قسم کی خصلتیں ان کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے؟ محض پریڈ سے تیار کی ہوئی فوج اسلام کے کسی کام کی نہیں۔ محض انتظامی قابلیت رکھنے والی سول سروس کی بھی اسے حاجت نہیں، اسے تو ان سپاہیوں اور ان کارکنوں

کی حاجت ہے جن کے اندر باضابطگی کے ساتھ تقویٰ بھی ہو جو سر کاٹنے اور کٹوانے کے ساتھ دل بدلنے اور اخلاق کو ڈھالنے کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ جو صرف زمین کا انتظام کرنے والے ہی نہ ہوں، بلکہ اہل زمین کی اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو آپ کا دل گواہی دے گا کہ اسلامی مقاصد کے لیے نماز کے سوا یا نماز سے بہتر کوئی دوسرا انظام تربیت ناممکن ہے۔ جو شخص اس نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک تربیت پائے اسی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ امانتوں اور ذمہ داریوں اور حقوق العباد کا جو بار دنیوی زندگی میں اس پر ڈالا جائے گا اس کو وہ خدا ترسی کے ساتھ سنبھالے گا۔ اور قعر دریا میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دے گا۔

اسی بنا پر قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ط (العنکبوت:۴۵)

''یقیناً نماز بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے''۔

اسی بنا پر قدیم زمانہ سے نماز اسلامی تحریک کا لازمی جز رہی ہے۔ جس قدر انبیاء خدا کی طرف سے دنیا میں آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی۔ کیونکہ اسلام کی تحریک میں جب کبھی زوال آیا، نماز کا نظام تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ سے آیا:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُواالصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰاتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ○ (مریم:۵۹)

''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گئے۔ سو عنقریب گمراہی کا انجام دیکھیں گے۔''

اس کی وجہ ظاہر ہے، اسلام کے طریقے پر چلنے کے لیے اسلامی سیرت ضروری ہے اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے۔ جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال وانحطاط ہے۔

ضبط نفس

تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے، جس کے بغیر تعمیر سیرت کا مدعا حاصل نہیں ہوسکتا۔ تعمیر سیرت کا کام بجائے خود صرف اتنا ہے کہ یہ انسانی خودی

کو تربیت دے کر مہذب بنا دیتی ہے لیکن اس تربیت یافتہ خودی کو ان جسمانی اور نفسانی قوتوں پر جو اس کے لیے آلہ کی حیثیت رکھتی ہیں عملاً پورا قابو حاصل نہ ہو تو اس کی تربیت وتہذیب کا مقصود یعنی صحیح برتاؤ اور ٹھیک چلن حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایک مثال کے پیرایہ میں اس کو یوں سمجھئے کہ انسان ایک موٹر اور ڈرائیور کے مجموعہ کا نام ہے۔ مجموعہ ٹھیک کام اسی حالت میں کرسکتا ہے جب کہ موٹر کے تمام آلات اور اس کی تمام طاقتیں ڈرائیور کے قابو میں ہوں اور ڈرائیور مہذب، تربیت یافتہ اور واقف راہ ہو۔ اگر آپ نے ڈرائیور کو تربیت دے کر تیار کر دیا مگر اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلیٹر پوری طرح اس کے قابو میں نہ آئے یا آئے تو سہی مگر ڈھیلے رہے تو اس صورت میں ڈرائیور موٹر نہ چلائے گا بلکہ موٹر ڈرائیور کو چلائے گی اور چونکہ موٹر صرف چلنا جانتی ہے، بینائی تمیز اور راستہ کی واقفیت نہیں رکھتی، اس لیے جب وہ ڈرائیور کو لے کر چلے گی تو اوندھے سیدھے راستے پر اسے کھینچے کھینچے پھرے گی۔ اس مثال کے مطابق انسان کی جسمانی طاقتیں اور اس کی نفسانی خواہشات اور ذہنی قوتیں موٹر کے حکم میں ہیں اور اس کی خودی ڈرائیور کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ موٹر ویسی ہی جاہل ہے جیسی لوہے والی موٹر ہوتی ہے مگر وہ بے جان ہے اور یہ جاندار، یہ خواہشات، جذبات اور داعیات بھی رکھتی ہے اور ہر وقت کوشش کرتی رہتی ہے کہ ڈرائیور اس کو نہ چلائے بلکہ یہ ڈرائیور کو چلائے، تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا مقصود ڈرائیور کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ وہ اس موٹر کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے بلکہ خود اس پر سوار ہو اور اسے اپنے اختیار سے چلا کر اس سیدھی شاہراہ پر سفر کرے جو منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔ اس غرض کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ ڈرائیور کو راستہ کا علم، موٹر کا طریق استعمال اور فی الجملہ ڈرائیوری کے آداب سکھا کر ایک مہذب اور تربیت یافتہ ڈرائیور بنا دیا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ اسٹیرنگ، بریک اور ایکسلیٹر ہر وقت مضبوطی کے ساتھ کسے ہوئے رکھے جائیں اور ڈرائیور کی گرفت ان پر ڈھیلی نہ ہونے پائے کیونکہ یہ منہ زور موٹر ہر وقت بے راہ روی کے لیے زور لگا رہی ہے۔

نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے لگایا گیا ہے کہ ڈرائیور اپنی موٹر پر پوری طرح قابو یافتہ رہے اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے، اس طریقہ سے موٹر کی منہ زوری روزانہ پانچ وقت توڑی جاتی ہے، بریک کسے جاتے ہیں۔ ایکسلیٹر اور اسٹیرنگ مضبوط کیے جاتے ہیں اور

ڈرائیور کی گرفت مستحکم کی جاتی ہے۔ صبح کا وقت ہے، نیند مزے کی آرہی ہے آرام طلب نفس کہتا ہے ''پڑے بھی رہو، اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے۔'' نماز کہتی ہے کہ ''وقت آچکا ہے، سیدھی طرح اٹھ، غسل کی حاجت ہے تو نہاؤ ورنہ وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے تو نہ سہی ٹھنڈے پانی سے طہارت کرو اور چلو مسجد کی طرف۔'' ان دو متضاد مطالبوں میں سے اگر آپ نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو موٹر آپ پر سوار ہوگئی اور اگر نماز کے مطالبے کو پورا کیا تو آپ موٹر پر سوار ہو گئے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہر وقت نفس کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے نکالتا ہے۔ موقع ڈھونڈتا رہتا ہے کہ ذرا آپ کے اندر کمزوری پیدا ہو اور یہ آپ پر سوار ہو جائے مگر نماز ہر موقع پر آپ کے لیے تازیانہ بن کر آتی ہے۔ آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے اور آپ سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی موٹر کو اپنے حکم کا تابع بناؤ، اس کے غلام بن کر نہ رہ جاؤ۔ یہ معرکہ روز پیش آتا ہے، مختلف اوقات، مختلف حالتوں اور مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے کبھی سفر میں اور کبھی حضر میں، کبھی گرمی میں اور کبھی جاڑے میں، کبھی آرام کے وقت اور کبھی کاروبار کے وقت، کبھی تفریح کے موقع پر اور کبھی رنج وغم اور مصیبت کے موقع پر، ان بے شمار مختلف النوع حالتوں میں نفس کی طلب اور نماز کی پکار کے مابین کش مکش ہوتی ہے، اور آپ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ نفس کی بات آپ نے مانی تو شکست کھا گئے، خادم آپ کا آقا بن گیا، اندھی، جاہل موٹر کے قابو میں آپ نے اپنے آپ کو دے دیا، اب یہ ٹیڑھے بینگے راستوں پر آپ کو لیے لیے پھرے گی اور آپ بے بسی کے عالم میں اس کے ساتھ ساتھ پھرتے رہیں گے۔ بخلاف اس کے اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ اس موٹر کا باغیانہ زور توڑ دیں گے، اس پر حکمراں بن جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم واذعان اور اپنے ارادے کے مطابق اس کے کل پرزوں اور اس کی قوتوں سے کام لیں۔

اسی بنا پر قرآن میں نماز کے ضائع کرنے کا فوری اور لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی شہوات کا تابع بن جاتا ہے اور سیدھے راستوں پر ہٹ کر ٹیڑھے راستوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (مریم:۵۹)

''پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات

کے پیچھے پڑ گئے لہٰذا عنقریب وہ گمراہی کا انجام دیکھیں گے۔''

افراد کی تیاری کا پروگرام

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ اب دوسرے پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے فرد کی تیاری کے اس پروگرام پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔ اس پروگرام کے پانچ حصے ہیں:

۱۔ آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کے ادراک کو تازہ رکھنا کہ وہ دنیا میں ایک خود مختار وجود نہیں ہے بلکہ رب العالمین کا بندہ ہے اور یہاں اسی حیثیت سے اس کو کام کرنا ہے۔

۲۔ بندہ کی حیثیت سے اس کو فرض شناس بنانا اور اس میں ادائے فرض کی عادت پیدا کرنا۔

۳۔ فرض شناس اور نا فرض شناس میں تمیز کرنا اور نا فرض شناس افراد کو چھانٹ کر الگ کر دینا۔

۴۔ خیالات کا ایک پورا نظام، ایک پوری آئیڈیالوجی آدمی کے ذہن میں اتار دینا اور اس کو ایسا مستحکم کرنا کہ ایک پختہ سیرت بن جائے۔

۵۔ آدمی میں یہ قوت پیدا کرنا کہ اپنے عقیدے اور اپنے علم و بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہو اس پر عمل کر سکے۔ اور اپنے جسم و نفس کی تمام طاقتوں سے اس راہ میں کام لے سکے، اس کے کیریکٹر میں اس قسم کا ڈھیلا پن نہ رہ جائے کہ صحیح تو سمجھتا ہو۔ ایک طریقہ کو، مگر اپنے نفس کی خواہش سے مجبور ہو کر چلے دوسرے طریقہ پر۔

اسلام جو سوسائٹی بناتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو وہ اس طرح نماز کے ذریعہ سے تیار کرتا ہے۔ دس برس کی عمر کے بعد اس سوسائٹی کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کو یہ نماز لازماً پڑھنی پڑتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد اس پر اس طرح فرض ہو جاتی ہے کہ یہ فرض کسی حال میں بھی اس سے ساقط نہیں ہوتا الّا یہ کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو یا عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہو۔ بیماری میں، سفر میں، جنگ کے معرکے تک میں یہ فرض اسے ادا کرنا پڑے گا۔ اٹھ نہ سکے تو بیٹھ کے پڑھے، بیٹھنا ممکن نہ ہو لیٹ کے پڑھے، ہاتھ پاؤں حرکت نہ کر سکتے ہوں، اشارے سے پڑھے، پانی نہ ملتا ہو تو مٹی سے تیمّم کر کے پڑھے، قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو جدھر گمان ہو اسی طرف منہ کر کے پڑھے۔ غرض کوئی عذر اس معاملہ میں مسموع نہیں ہے۔ نماز کا وقت جب آ جائے تو ہر حال میں مسلمان مامور ہے کہ اس فرض کو ادا کرے۔

بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے سوا دنیا میں کوئی دوسرا اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے اپنے اجزائے ترکیبی یعنی اپنے افراد کو فرداً فرداً تیار کرنے کا ایسا مکمل انتظام کیا ہو۔ دنیا کے اجتماعی نظام میں عموماً جماعت کی ہیئت ترکیبی بنانے اور افراد کو بیرونی بندشوں سے جکڑنے ہی پر تمام زور دیا جاتا ہے مگر جماعت کے ایک ایک جز کو اندر سے تیار کرنے اور جماعتی اصولوں کے مطابق بنانے کی کوشش کم کی جاتی ہے۔ حالانکہ جماعت کی حیثیت ایک دیوار کی سی ہے جو اینٹوں سے بنتی ہے۔ ایک ایک اینٹ اگر مضبوط نہ ہو تو دیوار بحیثیت مجموعی کمزور ہوگی۔ اسی طرح افراد کی سیرت میں اگر کمزوری ہو، اگر ان کے خیالات جماعتی اصولوں کے مطابق نہ ہوں اور اگر عملاً وہ جماعتی راہ کے خلاف چلنے کے میلانات رکھتے ہوں تو محض بیرونی بندشیں جماعت کے نظام کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکتیں۔ آخر کار بغاوت رونما ہوگی اور نظام ٹوٹ جائے گا۔

تنظیم جماعت

اب ہمیں نماز کے دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی جب تک جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ فرد اپنے نصب العین کو پا ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ لوگ جن کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہا ہے اس نصب العین تک پہنچنے میں اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ فرد جن اصولوں پر ایمان رکھتا ہے ان کے مطابق تنہا عمل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے تاوقتیکہ پوری جماعتی زندگی ان ہی اصولوں پر قائم نہ ہو جائے۔ آدمی دنیا میں اکیلا پیدا نہیں ہوا ہے نہ اکیلا رہ کر کوئی کام کرسکتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور زندگی کے بے شمار ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ دنیا میں وہ خدا کی طرف سے مامور اسی پر کیا گیا ہے کہ اس اجتماعی زندگی اور ان اجتماعی تعلقات میں خدا کے قانون کو جاری کرے، اس قانون پر عمل کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا نام ہی عبادت ہے۔ اگر آدمی ایسے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہو جو اس قانون کو مانتے ہی نہ ہوں یا سب کے سب اس کی نافرمانی پر تلے ہوئے ہوں یا ان کے باہمی تعلقات اس طرح کے ہوں کہ اس کو جاری کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اکیلے آدمی کے لیے خود اپنی زندگی میں بھی اس پر عمل کرنا غیر ممکن ہے، کجا کہ وہ جماعتی زندگی میں اس کو نافذ کرسکے۔

علاوہ بریں مسلمان کے لیے یہ دنیا سخت جدوجہد، مقابلہ اور کش مکش کا معرکہ کارزار ہے۔ یہاں خدا سے بغاوت کرنے والوں کے بڑے بڑے جتھے بنے ہوئے ہیں جو انسانی زندگی میں خود اپنے بنائے ہوئے قوانین کو پوری قوت کے ساتھ جاری کر رہے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمان پر بھاری کمر توڑ دینے والی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ یہاں خدا کے قانون کو پھیلائے اور جاری کرے۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین جہاں جہاں چل رہے ہیں انہیں مٹائے اور ان کی جگہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے قانون کا نظام زندگی قائم کیا جائے۔ یہ زبردست خدمت جو اللہ نے مسلمان کے سپرد کی ہے، اس کو اللہ کے باغی جتھوں کے مقابلہ میں کوئی اکیلا مسلمان انجام نہیں دے سکتا۔ اگر کروڑوں مسلمان بھی دنیا میں موجود ہوں مگر الگ الگ رہ کر انفرادی کوشش کریں تب بھی وہ مخالفین کی منظم طاقت کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ سارے بندے جو خدا کی عبادت کرنا چاہتے ہیں ایک جتھا بنیں، ایک دوسرے کے مددگار بنیں، ایک دوسرے کے پشت پناہ بن جائیں اور مل کر اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کریں۔

ان دونوں اغراض کے لیے مسلمانوں کا صرف مل جانا ہی کافی نہیں بلکہ یہ ملنا صحیح طریق پر ہونا چاہیے، صرف اجتماعی نظام پیدا ہو جانا کافی نہیں، بلکہ ایک صالح اور اجتماعی نظام درکار ہے جس میں مسلمان اور مسلمان کا تعلق ٹھیک ٹھیک ویسا ہی ہو جیسا کہ اسلام چاہتا ہے، ان کے درمیان محبت اور ہمدردی ہو، یک جہتی اور وحدت فی العمل ہو، سب کے اندر خدا کی بندگی کرنے کا مشترک ارادہ نہ صرف موجود ہو بلکہ پیہم متحرک رہے، حرکت کرنے کی عادت ان کی طبیعت ثانیہ بن جائے، ان میں سے ہر ایک جانتا ہو کہ جب وہ لیڈر بنے تو جماعت میں ان کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور جب کوئی دوسرا ان کا لیڈر ہو تو وہ کس طرح اس کی اطاعت کریں، کس طرح اس کے حکم پر حرکت کریں، کہاں تک اس کی فرماں برداری ان پر واجب ہے، کہاں انہیں اس کو ٹوکنا چاہیے اور کس حد پر پہنچ کر وہ ان کی اطاعت کا مستحق نہیں رہتا۔

نماز باجماعت

نماز انفرادی سیرت کی تعمیر کے ساتھ یہ کام بھی کرتی ہے، وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے، اس کو قائم کرتی ہے اور قائم رکھتی ہے اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے، اسی لیے پنج وقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا شرط

لازم قرار دیا گیا ہے۔ شریعت کی رو سے ایک ایک شخص الگ الگ نماز پڑھ کر فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتا بلکہ تمام مسلمانوں کا مسجد میں حاضر ہونا اور باجماعت نماز پڑھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ خود نماز پڑھنا فرض ہے۔ الا یہ کہ کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں قیام جماعت ممکن نہ ہو۔ جماعت کی اس تاکید کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کا نظام اجتماعی اپنی صحیح صورت پر قائم اور متحرک رہے۔ مسجد کا پنج وقتہ اجتماع مسلمانوں کے نظام اجتماعی کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کی مضبوطی پر اس پورے نظام کی مضبوطی منحصر ہے۔ ادھر یہ کمزور ہوئی ادھر سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔

اذان

حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی اٹھ جاؤ اور اپنے اپنے کام چھوڑ کر مسجد کی طرف رخ کرو۔ اس طلبی کی پکار کو سن کر ہر طرف سے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف دوڑنا وہی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے جو فوج کی ہوتی ہے۔ فوجی سپاہی جہاں جہاں بھی ہوں بگل کی آواز سنتے ہی سمجھ لیتے ہیں کہ ہمارا کمانڈر ہمیں بلا رہا ہے۔ اس طلبی پر سب کے دل میں ایک ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی کمانڈر کے حکم کی پیروی کا خیال۔ اور اس خیال کے آتے ہی سب ایک ہی کام کرتے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے کام چھوڑ کر اٹھنا، ہر طرف سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جانا۔ فوج میں یہ طریقہ کس لیے رکھا گیا ہے؟ اسی لیے کہ اول تو ہر ہر سپاہی میں فرداً فرداً حکم ماننے اور اس پر مستعدی کے ساتھ عمل کرنے کی خصلت و عادت پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ایسے تمام فرماں بردار سپاہی مل کر ایک گروہ، ایک جتھا، ایک ٹیم بن جائیں اور ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے کہ کمانڈر کا حکم پاتے ہی ایک وقت میں ایک جگہ سب مجتمع ہو جایا کریں تاکہ جب کوئی مہم پیش آئے تو ساری فوج ایک آواز پر ایک مقصد کے لیے اکٹھی ہو کر کام کر سکے۔ فوجی اصطلاح میں اس کو سرعت اجتماع کہتے ہیں، اور یہ فوجی زندگی کی جان ہے۔ اگر کسی فوج میں اس طرح جمع ہونے کی صلاحیت نہ ہو اور اس کے سپاہی ایسے خودسر ہوں کہ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہو ادھر چلا جاتا ہو تو خواہ ایسی فوج کا ایک ایک سپاہی تیس مار خاں ہی کیوں نہ ہو، وہ کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ اس قسم کے ایک ہزار بہادر سپاہیوں کو دشمن کے پچاس سپاہیوں کا ایک منظّم دستہ الگ الگ پکڑ کر ختم کر سکتا ہے۔ ٹھیک اسی مصلحت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ جو مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سنے، سب کام چھوڑ کر اپنے قریب کی مسجد کا رخ کرے۔ اس اجتماع کی مشق ان کو روزانہ

پانچ وقت کرائی جاتی ہے کیونکہ اس خدائی فوج کی ڈیوٹی دنیا کی ساری فوجوں سے زیادہ سخت ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے دوسری فوجوں کے لیے تو مدتوں میں کبھی ایک مہم پیش آتی ہے اور اس کی خاطر ان کو یہ ساری فوجی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ مگر اس خدائی فوج کو تو ہر وقت ایک مہم درپیش ہے اس لیے اس کے ساتھ یہ بھی بہت بڑی رعایت ہے کہ اسے دن رات میں صرف پانچ مرتبہ ہی خدائی بگل کی آواز پر دوڑنے اور خدائی چھاؤنی یعنی مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

مسجد میں اجتماع

یہ محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور صرف اس جمع ہونے ہی میں بے شمار فائدے ہیں۔ یہاں جو آپ نے ایک دوسرے کو دیکھا، پہچانا، ایک دوسرے سے واقف ہوئے، یہ دیکھنا، پہچاننا، واقف ہونا، کس حیثیت سے ہے؟ اس حیثیت سے کہ آپ سب خدا کے بندے ہیں، ایک رسول کے پیرو ہیں، ایک کتاب کے ماننے والے ہیں، ایک ہی مقصد سب کی زندگی کا ہے اسی مقصد کے لیے آپ مسجد میں جمع ہوئے ہیں اور اسی مقصد کے لیے مسجد سے باہر جا کر بھی آپ کو عمل کرنا ہے۔ اس قسم کا تعارف آپ میں خود بخود یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ آپ سب ایک پارٹی اور ایک جماعت ہیں۔ ایک ہی پارٹی کے سپاہی ہیں، ایک دوسرے کے بھائی اور رفیق ہیں دنیا میں آپ کی اغراض اور آپ کے مقاصد، آپ کے نقصانات اور آپ کے فوائد سب مشترک ہیں، آپ کی زندگیاں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اٹھیں گے تو ایک ساتھ، گریں گے تو ایک ساتھ۔

پھر آپ جو ایک دوسرے کو دیکھیں گے تو ظاہر ہے کہ آنکھیں کھول کر دیکھیں گے اور یہ دیکھنا بھی دشمن کو دشمن کا دیکھنا نہیں بلکہ دوست کا دوست کو اور بھائی کا بھائی کو دیکھنا ہوگا۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ چہرہ لیے ہوئے آیا ہے، کوئی معذور لنگڑا لولا یا اندھا ہے تو خواہ مخواہ آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوگا۔ اپنے میں سے جو خوش حال ہیں وہ غریبوں اور بے کسوں پر رحم کھائیں گے۔ جو بدحال ہیں انہیں امیروں تک پہنچنے اور اپنا حال کہنے کی ہمت ہوگی۔ کسی کے متعلق معلوم ہوگا کہ بیمار ہے یا مصیبت میں پھنس گیا ہے اس لیے مسجد نہیں آیا تو آپ اس کی عیادت کو جائیں گے، کسی کے مرنے کی خبر ملی تو آپ اس کے جنازے میں شریک ہوں گے اور غم زدہ عزیزوں کو تسلی دیں گے، یہ سب باتیں آپس کی محبت کو بڑھانے والی، آپ کو ایک دوسرے سے

قریب کرنے والی اور ایک دوسرے کا مددگار بنانے والی ہیں۔ اور ذرا غور کیجئے یہاں جو آپ جمع ہوئے ہیں تو ایک پاک جگہ، پاک مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آپ کو کسی فلم اسٹار کا عشق یہاں کھینچ کر نہیں لایا ہے۔ آپ شراب خوری یا جوئے بازی کے لیے یہاں جمع نہیں ہوئے ہیں۔ یہ بدکاروں کا اجتماع نہیں ہے کہ سب کے دل میں ناپاک خواہشیں اور نیتیں بھری ہوں۔ یہ تو اللہ کے نیک بندوں کا اجتماع ہے، اللہ کی عبادت کے لیے اللہ کے گھر میں سب اپنے خدا کے سامنے بندگی کا اقرار کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر اول تو ایمان دار آدمی کے دل میں خود ہی اپنے گناہوں پر شرمندگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اگر اس نے کوئی گناہ اپنے دوسرے بھائی کے سامنے کیا تھا اور وہ بھی یہاں مسجد میں موجود ہے تو محض اس کی نگاہوں کا سامنا ہو جانا ہی کافی ہے کہ گناہ گار اپنے دل میں کٹ کٹ جائے اور اگر کہیں مسلمانوں میں ایک دوسرے کو نصیحت کرنے کا جذبہ بھی موجود ہو اور وہ جانتے ہوں کہ ہمدردی و محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی اصلاح کس طرح کرنی چاہیے۔ تو یقین جانیے کہ یہ اجتماع انتہائی رحمت و برکت کا موجب ہوگا۔ اس طرح سب مسلمان مل کر ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کریں گے۔ ایک دوسرے کے نقائص کی اصلاح کریں گے اور پوری جماعت صالحین کی جماعت بنتی چلی جائے گی۔

صف بندی

یہ صرف مسجد میں جمع ہونے کی برکتیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں کتنی برکات ہیں۔

سب مسلمان مسجد میں مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا تو وہ پہلی صف میں ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو وہ پچھلی صفوں میں ہوگا۔ کوئی بڑے سے بڑا آدمی مسجد میں اپنی سیٹ ریزرو نہیں کرا سکتا۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ دوسرے مسلمان کو مسجد میں کسی جگہ کھڑا ہونے سے روک دے یا جہاں وہ پہلے سے موجود ہو وہاں سے اس کو ہٹا دے۔ کوئی اس کا مجاز نہیں کہ آدمیوں پر سے پھاند کر یا صفوں کو چیر کر آگے پہنچنے کی کوشش کرے۔ سب مسلمان ایک صف میں ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوں گے۔ وہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ کوئی اونچ ہے نہ نیچ، نہ کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک ہوتا ہے نہ کسی کے برابر کھڑے ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ بازار کا جاروب کش آئے گا اور گورنر کے برابر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ وہ اجتماعی جمہوریت ہے جسے قائم کرنے

میں اسلام کے سوا کوئی کامیاب نہیں ہوسکا۔ یہاں روزانہ پانچ وقت سوسائٹی کے افراد کی اونچ نیچ برابر کی جاتی ہے۔ بڑوں کے دماغ سے کبریائی کا غروز نکالا جاتا ہے، چھوٹوں کے ذہن سے پستی کا احساس دور کیا جاتا ہے۔ اور سب کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب یکساں ہو۔

یہ صف بندی جس طرح طبقاتی امتیازات کو مٹاتی ہے اسی طرح نسل، قبیلہ، وطن اور رنگ وغیرہ کی عصبیتوں کو بھی مٹاتی ہے۔ مسجد میں کسی امتیازی نشان کے لحاظ سے مختلف انسانی گروہوں کے بلاک الگ نہیں ہوتے۔ تمام مسلمان جو مسجد میں آئیں خواہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا فرنگی، سامی ہوں یا آرین اور ان کے قبیلوں اور ان کی زبانوں میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں، بہرحال سب کے سب ایک صف میں کھڑے ہوکر نماز ادا کرتے ہیں۔ روزانہ پانچ وقت اس نوع کا اجتماع ان تعصّبات کی بیخ کنی کرتا رہتا ہے جو انسانی جماعت میں خارجی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوگئے ہیں، یہ انسانی وحدت قائم کرتا ہے، بین الاقوامیت کی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور اس خیال کو دماغوں میں پیوست کردیتا ہے کہ حسب ونسب اور برادریوں کی ساری عصبیتیں جھوٹی ہیں۔ تمام انسان خدا کے بندے ہیں اور اگر خدا کی بندگی وعبادت پر وہ سب متفق ہوجائیں تو پھر وہ سب ایک امت ہیں۔ پھر جب یہ سب ایک صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ رکوع وسجدہ کرتے ہیں تو ان کے اندر منظّم اجتماعی حرکت کرنے کی وہ صلاحیتیں پرورش پاتی ہیں جنہیں پیدا کرنے کے لیے فوج کو پریڈ کرائی جاتی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ مسلمانوں میں یکجہتی اور وحدت فی العمل پیدا ہو اور وہ خدا کی بندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر تن واحد کی طرح ہوجائیں۔

اجتماعی دعائیں

صف بندی کے ان تمام فائدوں کو وہ دعائیں دوآتشہ کردیتی ہیں، جو نماز میں خدا سے مانگی جاتی ہیں۔ سب یک زبان ہوکر اپنے مالک سے عرض کرتے ہیں:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

اِھْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ''ہم سب کو سیدھے راستے کی ہدایت دے۔''

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِاللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔

''ہم سب پر سلامتی ہو اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی۔''

نماز کی دعاؤں میں کہیں آپ کو واحد کا صیغہ نہ ملے گا۔ جہاں آپ دیکھیں گے جمع ہی کا صیغہ پائیں گے۔ اجتماعی عبادت اور اجتماعی حرکات کے ساتھ مل کر یہ اجتماعی دعائیں ہر مسلمان کے ذہن میں یہ نقش ثبت کر دیتی ہیں اور روزانہ ثبت کرتی رہتی ہیں کہ وہ اکیلا نہیں ہے اسے سب کچھ تنہا اپنے ہی لیے چاہنا اور مانگنا نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی جماعت کے ساتھ مربوط ہے۔ جماعت کی بھلائی میں اس کی بھلائی ہے، جماعت ہی کے راہ راست پر چلنے میں اس کی خیر ہے، خدا کی طرف سے فضل اور سلامتی جماعت پر نازل ہوگی، تب ہی وہ خود بھی اس سے متمتع ہو سکے گا۔ یہ چیز دماغوں سے انفرادیت کو نکالتی ہے، اجتماعی ذہنیت پیدا کرتی ہے۔ افراد جماعت میں خیر خواہی کے جذبات اور مخلصانہ محبت کے روابط کو نشو ونما دیتی ہے اور روزانہ پانچ مرتبہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے احساس اجتماعیت کو اکسایا جاتا ہے تاکہ مسجد کے باہر زندگی کے وسیع میدان میں ان کا برتاؤ درست رہے۔

امامت

یہ اجتماعی عبادات ایک امام کے بغیر انجام نہیں پاتیں۔ دو آدمی بھی اگر فرض نماز پڑھیں تو لازم ہے کہ ان میں سے ایک امام بنے اور دوسرا مقتدی، جماعت جب کھڑی ہو جائے تو اس سے الگ نماز پڑھنا سخت ممنوع ہے بلکہ ایسی نماز ہوتی ہی نہیں۔ حکم ہے کہ جو آتا جائے اسی امام کے پیچھے جماعت میں شامل ہوتا جائے۔ امامت کا منصب کسی طبقہ یا کسی نسل یا کسی گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں، نہ اس کے لیے کوئی ڈگری یا سند درکار ہے۔ ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ شریعت یہ سفارش کرتی ہے کہ امام بنانے میں آدمی کی چند صفات کا لحاظ کیا جائے جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

جماعت میں امام اور مقتدیوں کا تعلق جس طور پر قائم کیا گیا ہے اس میں ایک ایک چیز انتہا درجہ کی معنی خیز ہے۔ اس میں دراصل ہر مسلمان کو قیادت اور اتباع قیادت کی مکمل ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ اس چھوٹی مسجد سے باہر اس وسیع مسجد میں جس کا نام زمین ہے مسلمانوں کا جماعتی نظام کیسا ہونا چاہیے؟ جماعت میں امام کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے حقوق کیا ہیں؟ اور امام بننے کی صورت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے؟ دوسری طرف جماعت کو اس کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے اور کن باتوں میں کرنی چاہیے؟ اگر وہ

غلطی کرے تو مسلمان کیا کریں؟ کہاں تک غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں؟ کہاں وہ اس کو ٹوکنے کے مجاز ہیں؟ کہاں اس سے یہ مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے؟ اور کس موقع پر وہ اس کو امامت سے ہٹا سکتے ہیں؟ یہ سب گویا چھوٹے پیمانے پر ایک بڑی سلطنت کو چلانے کی مشق ہے جو ہر روز پانچ مرتبہ چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں مسلمانوں سے کرائی جاتی ہے۔

ہدایت کی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو پرہیز گار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو اور سن رسیدہ بھی ہو۔ حدیث میں ترتیب بھی بتادی گئی ہے کہ ان صفات میں سے کون سی صفت کس صفت پر مقدم ہے۔ یہیں سے یہ تعلیم بھی دیدی گئی ہے کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

حکم ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو، یوں تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے۔ لیکن اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کی اقتداء کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ یہاں بھی سردار قوم کے انتخاب کا ایک قاعدہ بتادیا گیا۔ ایک بری شہرت کا آدمی جس کی بدسیرتی و بدکرداری سے عام لوگ نفرت کرتے ہوں اس قابل نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کا امیر بنایا جائے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے۔ محض جوان، مضبوط، تندرست اور فرصت والے آدمیوں کو ہی پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قرأت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، اور ایسے مشغول آدمی بھی ہیں جو اپنا کام چھوڑ کر نماز کے لیے آئے ہیں اور جن کو نماز سے پھر اپنے کام کی طرف واپس جانا ہے۔ نبیؐ نے اس معاملہ میں یہاں تک رحم اور شفقت کا نمونہ پیش فرمایا ہے کہ نماز پڑھانے میں اگر کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز مختصر کردیتے تھے تاکہ اگر بچے کی ماں جماعت میں شامل ہے تو اسے تکلیف نہ ہو۔ یہ گویا سردار قوم کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو جماعت میں اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے؟

حکم ہے کہ اگر نماز پڑھانے کے دوران میں امام کو کوئی حادثہ پیش آجائے جس کی وجہ سے وہ نماز پڑھانے کے قابل نہ رہے تو فوراً ہٹ جائے اور اپنی جگہ پیچھے کے آدمی کو کھڑا کر دے۔ یہاں پھر سردار قوم کے لیے ایک ہدایت ہے۔ اس کا بھی یہی فرض ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو سرداری کے قابل نہ پائے تو خود ہٹ جائے اور دوسرے اہل آدمی کے لیے جگہ خالی

کر دے۔ اس میں نہ شرم کا کوئی کام ہے اور نہ خود غرضی کا۔

حکم ہے کہ امام کے فعل کی سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا سخت ممنوع ہے حتی کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جائے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز وہ گدھے کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ یہاں قوم کو سبق دیا گیا ہے کہ اسے اپنے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔

امام اگر نماز میں غلطی کرے، مثلاً جہاں اسے بیٹھنا چاہیے تھا وہاں کھڑا ہو جائے یا جہاں کھڑا ہونا چاہیے تھا وہاں بیٹھ جائے تو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے غلطی سے متنبہ کرو۔ سبحان اللہ کے معنی ہیں، ''اللہ پاک ہے''۔ امام کی غلطی پر سبحان اللہ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ خطا سے پاک تو بس اللہ ہی کی ذات ہے۔ تم انسان ہو، تم سے بھول چوک ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ طریقہ ہے امام کو ٹوکنے کا۔

اور جب اس طرح امام کو ٹوکا جائے تو اس کو لازم ہے کہ بلا کسی شرم و لحاظ کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور صرف اصلاح ہی نہ کرے بلکہ نماز ختم کرنے سے پہلے اللہ کے سامنے اپنے قصور کے اعتراف میں دو مرتبہ سجدہ بھی کرے۔ البتہ اگر ٹوکے جانے کے باوجود امام کو اس امر پر پورا یقین ہو کہ اس مقام پر اسے کھڑا ہونا ہی چاہیے تھا، یا بیٹھنا ہی چاہیے تھا تو وہ اپنے وثوق کے مطابق عمل کر سکتا ہے اس صورت میں جماعت کا کام یہ ہے کہ وہ امام کا ساتھ دے۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ اس امر کا یقین واثق ہی کیوں نہ رکھتی ہو کہ امام غلطی کر رہا ہے۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد مقتدیوں کو حق ہے کہ امام پر اس کی غلطی ثابت کریں اور اس سے مطالبہ کریں کہ دوبارہ نماز پڑھائے۔

امام کے ساتھ جماعت کا یہ طرز عمل تو صرف ان غلطیوں کے بارے میں ہے جو معمولی جزئیات سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اگر امام سنت نبویؐ کے خلاف نماز کی ہیئت اور ترتیب بدل دے یا قرآن کو تحریف کر کے پڑھے، یا نماز پڑھانے کے دوران میں کفر و شرک یا صریح معصیت کا ارتکاب کرے یا کوئی اور ایسا فعل کرے جس سے معلوم ہو کہ یا تو قانون الٰہی کی پیروی سے منحرف ہو گیا ہے یا اس کی عقل میں فتور آ گیا ہے تو جماعت کا فرض ہے کہ نماز توڑ کر اس سے الگ ہو جائے اور اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ قائم کرے۔ پہلی صورت میں امام کی پیروی نہ کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، دوسری صورت میں اس کی پیروی کرنا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

بعینہٖ یہی حیثیت بڑے پیمانہ پر قوم اور اس کے سردار سے تعلق کی بھی ہے۔ جب تک

سردار اسلامی کانسٹی ٹیوشن کے اندر کام کر رہا ہے اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے، نافرمانی کریں گے تو گناہ گار ہوں گے۔ زیادہ سے زیادہ اسے وہ ٹوک سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ٹوکنے پر بھی وہ فروعی معاملات میں غلطیاں کرے تو انہیں اس کی اطاعت پر قائم رہنا چاہیے۔ مگر جب وہ اسلامی کانسٹی ٹیوشن کی حدود سے نکل رہا ہو تو پھر وہ مسلمانوں کی جماعت کا امیر نہیں رہ سکتا۔

یہاں تک نماز کے مقاصد اور اس کے اثرات کی جو تحقیق کی گئی ہے اگرچہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے تاہم اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کو اسلام کا رکن اعظم کیوں قرار دیا گیا ہے۔ رکن ستون کو کہتے ہیں جس کے سہارے پر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اسلامی زندگی کی عمارت کو قائم ہونے اور قائم رہنے کے لیے جن سہاروں کی ضرورت ہے ان میں سب سے مقدم سہارا یہ ہے کہ مسلمانوں کے افراد میں فرداً فرداً اور ان کی جماعت میں بہ حیثیت مجموعی وہ اوصاف پیدا ہوں جو خدا کی بندگی کا حق ادا کرنے اور دنیا میں خلافت الٰہی کا بار سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ وہ غیب پر سچا اور زندہ ایمان رکھنے والے ہوں، وہ اللہ کو اپنا واحد فرماں روا تسلیم کریں اور اس کے فرض شناس اور اطاعت کیش بندے ہوں۔ اسلام کا نظام فکر و نظریہ حیات ان کی رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جائے کہ اسی بنیاد پر ان میں ایک پختہ سیرت پیدا ہو اور ان کا عملی کردار اسی کے مطابق ڈھل جائے۔ اپنی نفسانی اور جسمانی قوتوں پر وہ اتنے قابو یافتہ ہوں کہ اپنے ایمان و اعتقاد کے مطابق ان سے کام لے سکیں۔ ان کے اندر منافقین کی جماعت اگر پیدا ہو گئی ہو یا باہر سے گھس آئی ہو تو وہ اہل ایمان سے الگ ممتاز ہو جائے۔ ان کی جماعت کا نظام اسلام کے اجتماعی اصولوں پر قائم ہو اور ایک مشین کی طرح پیہم متحرک رہے۔ ان میں اجتماعی ذہنیت کارفرما ہو، ان کے درمیان محبت ہو، ہمدردی ہو، تعاون ہو، مساوات ہو، وحدت روح اور وحدت عمل ہو، وہ قیادت اور اقتداء کی حدود کو جانتے اور سمجھتے ہوں اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ تمام مقاصد چونکہ نماز کی اقامت سے حاصل ہوتے ہیں لہٰذا اس کو دین اسلام کا ستون قرار دیا گیا۔ یہ ستون اگر منہدم ہو جائے تو مسلمانوں کی انفرادی سیرت اور اجتماعی ہیئت دونوں مسخ ہو کر رہ جائیں اور وہ مقصد عظیم کے لیے کام کرنے کے اہل ہی نہ رہیں جس کی خاطر جماعت وجود میں آئی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ نماز عماد الدین ہے، یعنی دین کا سہارا ہے جس نے اسے گرایا اس نے دین کو گرا دیا۔

روزہ

ان مقاصد کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے صرف نماز کو کافی نہ سمجھا گیا، بلکہ اس رکن کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے ایک دوسرے رکن روزہ کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔ نماز کی طرح یہ روزہ بھی قدیم ترین زمانہ سے اسلام کا رکن رہا ہے۔ اگرچہ تفصیلی احکام کے لحاظ سے اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں مگر جہاں تک نفس روزہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ الٰہی شریعتوں کا جزو لاینفک ہی رہا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کے مذہب میں یہ فرض کی حیثیت سے شامل رہا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (البقرہ:۱۸۳)

''روزہ تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ پچھلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔''

اس سے یہ بات خود بخود مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی فطرت کے ساتھ اس طریق تربیت کو ضرور کوئی خاص مناسبت ہے۔

زکوٰۃ اور حج کی طرح روزہ ایک مستقل جداگانہ نوعیت رکھنے والا رکن نہیں ہے، بلکہ دراصل اس کا مزاج قریب وہی ہے جو رکن صلوٰۃ کا ہے اور اسے رکن صلوٰۃ کے ساتھ مددگار اور معاون ہی کی حیثیت سے لگایا گیا ہے۔ اس کا کام ان ہی اثرات کو زیادہ تیز اور زیادہ مستحکم کرنا ہے جو نماز سے انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، نماز روزمرہ کا معمولی نظام تربیت ہے جو ہر روز پانچ وقت تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے آدمی کو اپنے اثر میں لیتا ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی ہلکی ہلکی خوراکیں دے کر چھوڑ دیتا ہے اور روزہ سال بھر میں ایک مہینہ کا غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹہ تک مسلسل اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجہ میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی معمولی تربیت میں جو اثرات خفیف تھے وہ شدید ہو جائیں۔ یہ غیر معمولی نظام تربیت کس طرح اپنا کام کرتا ہے اور کس کس ڈھنگ سے نفس انسانی پر مطلوب اثر ڈالتا ہے؟ اس کا تفصیلی جائزہ ہم ان صفحات میں لینا چاہتے ہیں۔

روزے کے اثرات

روزہ کا قانون یہ ہے کہ آخر شب میں طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکا یک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ اس دوران میں پانی کا ایک قطرہ اور خوراک کا ایک ریزہ قصداً حلق سے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی، اور زوجین کے لیے ایک دوسرے سے قضائے شہوت کرنا بھی حرام ہوتا ہے۔ پھر شام کو ایک خاص وقت آتے ہی اچانک حرمت کا بند توڑ دیا جاتا ہے۔ وہ سب چیزیں جو ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں یکا یک حلال ہو جاتی ہیں اور رات بھر حلال رہتی ہیں، یہاں تک کہ، دوسرے روز کی مقررہ ساعت آتے ہی پھر حرمت کا قفل لگ جاتا ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے۔ گویا پورے تیس دن ایک شدید ڈسپلن کے تحت رکھا جاتا ہے۔ مقررہ وقت تک سحری کرے، مقررہ وقت پر افطار کرے، جب تک اجازت ہے اپنی خواہشات نفس پوری کرتا رہے اور جب اجازت سلب کر لی جائے تو ہر اس چیز سے رک جائے جس سے منع کیا گیا ہے۔

احساس بندگی

اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے نظر میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقہ سے انسان کے شعور میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا طاقت ور بنا دینا چاہتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری کو اللہ کے آگے بالفعل تسلیم کر دے، یہ اعتراف تسلیم ہی دراصل اسلام کی جان ہے اور اسی پر آدمی کے مسلم ہونے یا نہ ہونے کا مدار ہے۔ دین اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ بس خداوند عالم کے وجود کو مان لے، یا محض مابعد الطبیعی نظریہ کی حیثیت سے اس بات کا اعتراف کر لے کہ اس کائنات کے نظام کو بنانے اور چلانے والا صرف ایک اللہ واحد قہار ہے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی اس امر واقعی کو ماننے کے ساتھ ہی اس کے منطقی اور فطری نتیجہ کو بھی قبول کرے۔ یعنی جب وہ یہ مانتا ہے کہ اس کا اور تمام دنیا کا خالق، پروردگار، قیام بخش مدبر امر صرف اللہ تعالیٰ ہے اور جب وہ تسلیم کرتا ہے کہ تخلیق میں کوئی اللہ کا شریک ہے نہ پرورش میں، نہ قیام بخشی میں اور نہ تدابیر امر میں، تو اس تسلیم و اعتراف

کے ساتھ ہی اسے اللہ کی حاکمیت وفرماں روائی کے آگے سپر ڈال دینی چاہیے۔ اپنی آزادی وخودمختاری کے غلط ادعا سے خیال اور عمل دونوں میں دست بردار ہوجانا چاہیے اور اللہ کے مقابلہ میں وہی رویہ اختیار کرلینا چاہیے جو ایک بندے کا اپنے مالک کے مقابلہ میں ہونا لازمی ہے۔ یہی چیز دراصل کفر اور اسلام کے درمیان فارق ہے۔ کفر کی حالت اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقابلہ میں خودمختار اور غیر جواب دہ سمجھے۔ اور یہی سمجھ کر اپنے لیے زندگی کا راستہ اختیار کرے۔ اور اسلام کی حالت اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اسی احساس بندگی وذمہ داری کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کرے۔ پس حالت کفر سے نکل کر حالت اسلام میں آنے کے لیے جس طرح اللہ کی حاکمیت کا سچا اور قلبی اقرار ضروری ہے اسی طرح اسلام میں رہنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل میں بندگی کا احساس وشعور ہر وقت زندہ اور ہر آن کارفرما رہے۔ کیونکہ اس احساس وشعور کے دور ہوتے ہی خودمختاری وغیر ذمہ داری کا رویہ عود کر آتا ہے اور کفر کی وہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ جس میں آدمی یہ سمجھتے ہوئے کام کرتا ہے کہ نہ اللہ اس کا حاکم ہے اور نہ اسے اللہ کو اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، نماز کا اولین مقصد انسان کے اندر اسلام کی اسی حالت کو پے در پے تازہ کرتے رہنا ہے اور یہی روزہ کا مقصد بھی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ نماز روزانہ تھوڑے وقفوں کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اس کو تازہ کرتی ہے اور رمضان کے روزے سال بھر میں ایک مرتبہ پورے ۷۲۰ گھنٹوں تک پیہم اس حالت کو آدمی پر طاری رکھتے ہیں کہ وہ پوری قوت کے ساتھ دل ودماغ میں بیٹھ جائے۔ اور سال کے باقی گیارہ مہینوں تک اس کے اثرات قائم رہیں۔ اول تو روزے کے سخت ضابطے کو اپنے اوپر نافذ کرنے کے لیے کوئی شخص اس وقت تک آمادہ ہی نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ وہ اللہ کو اپنا حاکم اعلیٰ نہ سمجھتا ہو اور اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی وخودمختاری سے دست بردار نہ ہوچکا ہو۔ پھر جب وہ دن کے وقت مسلسل بارہ بارہ تیرہ تیرہ گھنٹے کھانے پینے اور مباشرت کرنے سے رکا رہتا ہے اور جب سحری کا وقت ختم ہوتے ہی نفس کے مطالبات سے یکا یک ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور جب افطار کا وقت آتے ہی نفس کے مطلوبات کی طرف اس طرح لپکتا ہے کہ گویا فی الواقع ہاتھوں اور اس کے منہ اور حلق پر کسی اور کی حکومت ہے جس کے بند کرنے سے وہ بند ہوتے ہیں اور جس کے کھولنے سے وہ کھلتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں

کہ اس دوران میں اللہ کی حاکمیت اور اپنی بندگی کا احساس اس پر ہر وقت طاری رہتا ہے۔ اس پورے ایک مہینہ کی طویل مدت میں یہ احساس اس کے شعور یا تحت الشعور سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا کیونکہ اگر غائب ہو جاتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ ضابطے کو توڑنے سے باز رہ جاتا۔

اطاعت امر

احساس بندگی کے ساتھ خود بخود جو چیز لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کے حکم کی اطاعت کرے۔

ان دونوں چیزوں میں ایسا فطری اور منطقی تعلق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ نہ ان کے درمیان کبھی تناقض کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے کہ اطاعت دراصل نتیجہ ہی اعتراف خداوندی کا ہے۔ آپ کسی کی اطاعت کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اس کی خداوندی[1] نہ مان لیں اور جب حقیقت میں کسی کی خداوندی آپ مان چکے ہیں تو اس کی بندگی و اطاعت سے کسی طرح باز بھی نہیں رہ سکتے۔ انسان اتنا احمق نہیں ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا حکم مانتا چلا جائے درآنحالیکہ وہ اس کے حق حکمرانی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اور نہ انسان میں اتنی جرأت موجود ہے کہ جس کو فی الواقع وہ اپنے قلب و روح میں حاکم ذی اختیار سمجھتا ہو اور جسے نافع وضار اور پروردگار مانتا ہو اس کی اطاعت سے منہ موڑ جائے۔ پس درحقیقت خداوندی کے اعتراف اور بندگی و اطاعت کے عمل میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناظرین چند اصطلاحات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ فارسی زبان میں خدا اور خداوند کے وہی معنی ہیں جو عربی میں اللہ اور رب کے معنی ہیں۔ انگریزی میں چھوٹے حرف کے ساتھ (GOD) کا بھی قریب قریب یہی مفہوم ہے۔ ہندی میں دیوی دیوتاؤں کے الفاظ بھی اسی کے قریب المعنی ہیں۔ ان تمام الفاظ کا استعمال دنیا کی مختلف قومیں ایسی ہستیوں کے متعلق کرتی رہی ہیں جن کے ہاتھوں میں انسان کو نفع اور نقصان پہنچانے کے لیے اختیارات ہوں۔ جن کا حکم اس کائنات کے نظام میں چھوٹے یا بڑے پیمانے پر چلتا ہو، جن کی بندگی بجالانے پر ہی انسان کی فلاح اور کامرانی موقوف ہو۔ جاہل قوموں کا ہمیشہ یہ گمان رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ایسی ہستیاں بہت اور بے شمار ہیں اور اس میں صرف غیر انسانی وجود مثلاً فرشتے اور جن ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض انسان مثلاً بادشاہ، اولیاء اور غیر معمولی کمالات دکھانے والے لوگ بھی شامل ہیں۔ اسی لیے قریب قریب سب زبانوں میں ان الفاظ کی جمع آتی ہے۔ چنانچہ عربی میں آلہہ اور ارباب، فارسی میں خدائیگان اور خداوندان، انگریزی میں (GODS) اور ہندی میں دیویوں اور دیوتاؤں کے الفاظ جمع کے ساتھ آتے ہیں۔ مگر ان سب کے اوپر ایک ہستی کا تصور بھی تمام قوموں میں رہا ہے جو ساری کائنات کی خالق ہے اور جو سب سے بالاتر ہے۔ عربی میں اللہ، فارسی میں خدائیگان، انگریزی میں بڑے حرف کے ساتھ (GOD) اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور یہ عین عقل اور منطق کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ہر پہلو سے کامل توافق ہو۔

آقائی وخداوندی میں توحید لامحالہ بندگی واطاعت میں توحید پر منتج ہوگی اور آقائی و خداوندی میں شرک کا نتیجہ لازماً بندگی واطاعت میں شرک ہوگا۔ آپ ایک کو خداوند سمجھیں گے تو ایک ہی کی بندگی بھی کریں گے۔ دس کی خداوندی کریں گے تو بندگی واطاعت کا رخ بھی ان دسوں کی طرف پھرے گا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ خداوندی تو ایک کی مان رہے ہوں اور بندگی دس کی بجالائیں یا خداوندی دس کی تسلیم کر رہے ہوں اور اطاعت ایک کی کریں۔

ذات خداوندی کا تعین لامحالہ سمت بندگی کے تعین پر منتج ہوگا۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ خداوند ایک کو مانیں اور اطاعت دوسرے کی کریں۔ تعارض کا امکان زبانی اعتراف اور واقعی بندگی میں تو ضرور ممکن ہے مگر قلب وروح کے حقیقی احساس وشعور اور جوارح کے عمل میں ہرگز ممکن نہیں۔ کوئی عقل اس چیز کا تصور نہیں کر سکتی کہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو جس کا بندہ سمجھ رہے ہیں اس کے بجائے آپ کی بندگی کا رخ کسی ایسی ہستی کی طرف پھر سکتا ہے جس کا بندہ آپ فی الحقیقت اپنے آپ کو نہ سمجھتے ہوں۔ بخلاف اس کے عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس کی طرف بھی آپ کی بندگی کا رخ پھر رہا ہے اسی کی خداوندی کا نقش دراصل آپ کے ذہن پر مرتسم ہے خواہ زبان سے آپ اس کے سوا کسی اور کی خداوندی کا اظہار کر رہے ہوں۔

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا) ہندی میں پرمیشور ہی اس ہستی کے نام ہیں اور اس کے نام کی جمع کسی زبان میں نہیں آتی۔ اسلام جس چیز کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جن اقتدار واختیارات کے لیے تم الٰہ اور خداوند وغیرہ لفظ بولتے ہو، وہ تنہا اسی ایک ہستی کے ہاتھ میں ہیں ساری کائنات میں صرف اسی کا حکم چلتا ہے تمہارا نفع ونقصان اسی کے ہاتھ میں ہے اور جن جن کو تم اس سلطنت میں ذی اقتدار سمجھ کر خدا اور خداوند اور دیوتا مانتے ہو۔ وہ سب تمہاری ہی طرح اس کے بندے ہیں حقیقی اقتدار میں ان کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں لہٰذا الٰہ اور رب اور خداوند اور گاڈ اور دیوتا بہت سے نہیں بلکہ صرف وہی ایک ہے جس کو تم اللہ اور دوسرے ہم معنی الفاظ سے یاد کرتے ہو۔ اس تعلیم کے لحاظ سے اصطلاحات میں جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم کے لیے تو وہی پچھلی اصطلاحیں برقرار رہیں گی اور وہ چھوٹے خداؤں اور بڑے خدا کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کرے گا۔ مگر مسلمان کے لیے الٰہ اور رب وہی ہوگا جو اللہ ہے۔ گاڈ، صرف بڑے حروف کے ساتھ باقی رہے گا اور چھوٹے حروف سے اس کا استعمال نہ ہوگا، دیوی اور دیوتا کے الفاظ پرمیشور میں گم ہو جائیں گے۔ خدا اور خداوند کے الفاظ صرف خداوند عالم کے ساتھ خاص ہو جائیں گے اور ان میں سے کسی لفظ کی جمع استعمال نہ کی جائے گی۔

خداوندی کے اعتراف و بندگی کے احساس میں کمی بیشی لازماً اطاعت امر کی کمی بیشی پر منتج ہوگی۔ کسی کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کا احساس آپ کے دل میں جتنا زیادہ شدید ہوگا اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اس کی اطاعت کریں گے اور اس احساس میں جتنی کمزوری ہوگی اتنی ہی اطاعت میں کمی واقع ہوگی حتی کہ اگر یہ احساس بالکل نہ ہو تو اطاعت بھی بالکل نہ ہوگی۔

ان مقامات کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام کا مدعا اللہ کی خداوندی کا اقرار کرانے اور اس کے سوا ہر ایک کی خداوندی کا انکار کرا دینے سے اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی و اطاعت نہ کرے۔ جب وہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ[1] کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت خالصاً و مخلصاً صرف اللہ کے لیے ہے۔ کسی دوسری مستقل بالذات طاعت کی آمیزش اس کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے پر انسان مامور ہے اور اس کی بندگی کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان اس کی اطاعت کے ساتھ کسی دوسرے کی اطاعت مخلوط نہ کرے۔ جب وہ کہتا ہے وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کی اطاعت پوری کی پوری اللہ ہی کے لیے وقف ہے اور ہر اس طاقت سے مسلمان کی جنگ ہے جو اس اطاعت میں حصہ بٹانا چاہتی ہو، جس کا مطالبہ یہ ہو کہ مسلمان خداوند عالم کے ساتھ ساتھ اس کی اطاعت بھی کرے، یا خداوند عالم کے بجائے صرف اسی کی اطاعت کرے۔ پھر جب وہ یہ کہتا ہے، هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ تو اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو۔ اطاعت اور بندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ اطاعت الٰہی کے نیچے آ جائے۔ جس کی فرماں برداری بھی خداوند عالم کی اجازت کے تحت ہو اور جس کی فرماں برداری کے لیے وہاں سے حکم یا سند جواز نہ ملے اس کا بند کاٹ ڈالا جائے۔ یہ اس دین حق اور اس ہدایت کا تقاضا ہے جو اللہ اپنے رسولؐ کے ذریعہ بھیجتا ہے۔ اس تقاضے کے مطابق خواہ انسان کے ماں باپ ہوں، خواہ خاندان اور سوسائٹی

---

[1] لفظ ''دین'' کے اصل معنی اطاعت کے ہیں اور مذہب و ملت کے لیے اس کا استعمال مجازاً اس بنا پر ہوتا ہے کہ مذہب و ملت دراصل ایک نظام اطاعت کا نام ہے جس کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد آدمی ایک قانون اور ضابطہ کی فرماں برداری قبول کرتا ہے۔

ہو، خواہ قوم اور حکومت ہو، خواہ امیر یا لیڈر ہو، خواہ علماء اور مشائخ ہوں، خواہ وہ شخص یا ادارہ ہو جس کی انسان خدمت کر کے پیٹ پالتا ہے۔ اور خواہ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشات ہوں، کسی کی اطاعت بھی خداوند عالم کی اصلی اور بنیادی اطاعت کی قید سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ جو اس کی خداوندی کا اقرار کر چکا اور جس نے اس کے لیے اپنی زندگی کو خالص کر دیا وہ جس کی بھی اطاعت کرے گا اللہ کی اطاعت کے تحت رہ کر کرے گا۔ جس حد تک جس کی بات ماننے کی وہاں سے اجازت ہوگی اسی حد تک مانے گا۔ اور جہاں اجازت کی حد ختم ہو جائے گی وہاں وہ ہر ایک کا باغی اور صرف اللہ کا فرماں بردار نکلے گا۔

روزے کا مقصد آدمی کو اسی اطاعت کی تربیت دینا ہے۔ وہ مہینہ بھر تک روزانہ کئی کئی گھنٹے آدمی کو اسی حالت میں رکھتا ہے کہ اپنی بالکل ابتدائی (ELEMENTARY) ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی اس کو خداوند عالم کے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ غذا کا ایک ریزہ اور پانی کا ایک قطرہ تک وہ حلق سے گزار نہیں سکتا جب تک کہ وہاں سے اجازت نہ ملے۔ ایک ایک چیز کے استعمال کے لیے وہ شریعت خداوندی کی طرف دیکھتا ہے۔ جو کچھ وہاں حلال ہے وہ اس کے لیے حلال ہے خواہ تمام دنیا اسے حرام کرانے پر متفق ہو جائے اور جو کچھ وہاں حرام ہے وہ اس کے لیے حرام ہے خواہ ساری دنیا مل کر اسے حلال کر دے۔ اس حالت میں خدائے واحد کے سوا کسی کا اذن اس کے لیے اذن نہیں۔ کسی کا حکم اس کے لیے حکم نہیں، اور کسی کی نہی اس کے لیے نہی نہیں۔ خود اپنے نفس کی خواہش سے لے کر دنیا کے ہر انسان اور ہر ادارے تک کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے حکم سے مسلمان رمضان میں روزہ چھوڑ سکتا ہو یا توڑ سکتا ہو۔ اس معاملہ میں نہ بیٹے پر باپ کی اطاعت ہے نہ بیوی پر شوہر کی، نہ ملازم پر آقا کی، نہ رعیت پر حکومت کی، نہ پیرو پر لیڈر یا امام کی، نہ مرید پر پیر کی بالفاظ دیگر اللہ کی بڑی اور اصلی اطاعت تمام اطاعتوں کو کھا جاتی ہے اور ۱۷۰ گھنٹہ کی اس طویل مشق و تمرین سے روزہ دار کے دل پر کالنقش فی الحجر یہ سکہ بیٹھ جاتا ہے کہ ایک ہی مالک کا وہ بندہ ہے، ایک ہی قانون کا وہ پیرو ہے اور ایک ہی مالک کا حلقہ اس کی گردن میں پڑا ہے۔

اس طرح یہ روزہ انسان کی فرماں برداریوں اور اطاعتوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی جانب پھیر دیتا ہے اور تیس دن تک روزانہ بارہ بارہ چودہ چودہ گھنٹہ تک اسی سمت میں جمائے رکھتا ہے تاکہ اپنی بندگی کے مرجع اور اپنی اطاعت کے مرکز کو وہ اچھی طرح

متحقق کر لے اور رمضان کے بعد جب اس ڈسپلن کے بند کھول دیے جائیں تو اس کی اطاعتیں اور فرماں برداریاں بکھر کر مختلف مرجعوں کی طرف بھٹک نہ جائیں۔ اطاعت امر کی اس تربیت کے لیے بظاہر انسان کی صرف دو خواہشوں (یعنی غذا لینے کی خواہش اور صنفی خواہش) کو چھانٹ لیا گیا ہے اور ڈسپلن کی ساری پابندیاں صرف ان ہی دو پر لگائی گئی ہیں۔ لیکن روزے کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی پر اس حالت میں خدا کی خداوندی اور بندگی وغلامی کا احساس پوری طرح طاری ہو جائے اور وہ ایسا مطیع امر ہو کر یہ ساعتیں گزارے کہ ہر اس چیز سے رکے جس سے خدا نے روکا ہے اور ہر اس کام کی طرف دوڑے جس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ روزے کی فرضیت کا اصل مقصد اسی کیفیت کو پیدا کرنا اور نشو ونما دینا ہے، نہ کہ کھانے پینے اور مباشرت سے روکنا۔ لہٰذا یہ کیفیت جتنی زیادہ ہو روزہ اتنا ہی مکمل ہے اور جتنی اس میں کمی ہو اتنا ہی وہ ناقص ہے۔ اگر کسی آدمی نے روزہ اس احمقانہ طریقے سے رکھا کہ جن چیزوں سے روزہ ٹوٹتا ہے ان سے پرہیز کرتا رہا اور باقی تمام ان افعال کا ارتکاب کیے چلا گیا جنہیں خدا نے حرام کیا ہے، تو اس کے روزے کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک مردہ لاش، کہ اس میں وہ اعضاء تو سب کے سب موجود ہیں جن سے صورت انسانی بنتی ہے مگر جان نہیں ہے، جس کی وجہ سے انسان انسان ہے۔ جس طرح اس بے جان لاش کو کوئی شخص انسان نہیں کہہ سکتا اسی طرح اس بے روح روزے کو بھی کوئی روزہ نہیں کہہ سکتا۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ

من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس للّٰه حاجة فی ان یدع طعامه وشرابه۔

''جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔''

جھوٹ بولنے کے ساتھ ''جھوٹ پر عمل کرنے'' کا لفظ جو فرمایا گیا ہے یہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔ دراصل یہ لفظ تمام نافرمانیوں کا جامع ہے۔ جو شخص خدا کو خدا کہتا ہے اور پھر اس کی نافرمانی کرتا ہے وہ حقیقت میں خود اپنے اقرار کی تکذیب کرتا ہے۔ روزے کا اصل مقصد تو عمل سے اس اقرار کی تصدیق ہی کرنا تھا مگر جب وہ روزے کے دوران اسی کی تکذیب کرتا رہا ہے تو پھر روزے میں بھوک پیاس کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ حالانکہ خدا کو اس کے خلوئے معدہ کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ اسی بات کو دوسرے انداز میں حضورؐ نے اس طرح بیان کیا ہے:

کم من صائم لیس له من صیامه الا الظماء و کم من قائم لیس له من قیامه الا السهر۔

”کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں جنہیں اس قیام سے رت جگے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

اور یہی بات ہے جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے واضح تر الفاظ میں ظاہر فرما دیا ہے کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ٥ (البقرہ:۱۸۳)

”تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس کے ذریعہ سے تقویٰ کرنے لگو گے۔“

یعنی روزے فرض کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقوے کی صفت پیدا ہو۔ تقویٰ کے اصل معنی حذر اور خوف کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد خدا سے ڈرنا اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ اس لفظ کی بہترین تفسیر جو میری نظر سے گزری ہے وہ ہے جو حضرت ابی بن کعبؓ نے بیان کی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا، تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا امیر المومنین! آپ کو کبھی کسی ایسے رستے سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں اور راستہ تنگ ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”بارہا۔“ انہوں نے پوچھا تو ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ”میں دامن سمیٹ لیتا ہوں اور بچتا ہوا چلتا ہوں کہ دامن کانٹوں میں نہ الجھ جائے۔“ حضرت ابیؓ نے کہا ”بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔“ زندگی کا یہ راستہ جس پر انسان سفر کر رہا ہے دونوں طرف افراط و تفریط، خواہشات اور میلانات نفس، وساوس و ترغیبات (TEMPTATIONS) گمراہیوں اور نافرمانیوں کی خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس راستہ پر کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے چلنا اور اطاعت حق کی راہ سے ہٹ کر بد اندیشی و بدکرداری کی جھاڑیوں میں نہ الجھنا، یہی تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے فرض کیے ہیں۔ یہ ایک مقوی دوا ہے جس کے اندر خدا ترسی و راست روی کی قوت بخشنے کی خاصیت ہے مگر فی الواقع اس سے یہ قوت حاصل کرنا انسان کی اپنی

استعداد پر موقوف ہے۔ اگر آدمی روزے کے مقصد کو سمجھے اور جو قوت روزہ دیتا ہے اس کو لینے کے لیے تیار ہو اور روزے کی مدد سے اپنے اندر خوف خدا اور اطاعت امر کی صفت کو نشو ونما دینے کی کوشش کرے تو یہ چیز اس میں اتنا تقویٰ پیدا کر سکتی ہے کہ صرف رمضان ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد بھی سال کے باقی گیارہ مہینوں میں وہ زندگی کی سیدھی شاہراہ پر دونوں طرف کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچائے ہوئے چل سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے لیے روزے کے نتائج (ثواب) اور منافع (اجر) کی کوئی حد نہیں لیکن اگر وہ اصل مقصد سے غافل ہو کر محض روزہ توڑنے ہی کو روزہ رکھنا سمجھے اور تقوے کی صفت حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ کرے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے نامۂ اعمال میں بھوک، پیاس اور رت جگے کے سوا اور کچھ نہیں پا سکتا۔ اسی لیے نبیؐ نے فرمایا:

کل عمل ابن آدم یضاعف الحسنة بعشر امثالها الی سبع مائة ضعف قال اللّٰه تعالٰی الا الصوم فانه لی وانا اجزی به۔

''آدمی کا ہر عمل خدا کے یہاں کچھ نہ کچھ بڑھتا ہے، ایک نیکی دس گنی سے سات سو گنی تک پھلتی پھولتی ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ مستثنیٰ ہے، وہ میری مرضی پر موقوف ہے جتنا چاہوں اس کا بدلہ دوں۔''

یعنی روزے کے معاملے میں بالیدگی وافزونی کا امکان بے حد وحساب ہے۔ آدمی اس سے جتنا تقویٰ حاصل کرنے کے لیے کوشش کرے اتنا ہی وہ بڑھ سکتا ہے۔ صفر کے درجہ سے لے کر اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں گنے تک دیا جا سکتا ہے بلکہ بے نہایت ترقی کر سکتا ہے۔ پس یہ معاملہ چونکہ آدمی کی اپنی استعدادِ اخذ وقبول پر منحصر ہے کہ روزے سے تقویٰ حاصل کرے یا نہ کرے اور کرے تو کس حد تک کرے۔ اس وجہ سے آیت مذکورہ بالا میں یہ نہیں فرمایا کہ روزہ رکھنے سے تم یقیناً متقی بن جاؤ گے بلکہ ''لَعَلَّكُمْ''[1] کا لفظ فرمایا، جس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ توقع کی جاتی ہے، یا ممکن ہے کہ اس ذریعہ سے تم تقویٰ کرنے لگو۔

---

[1] عام طور پر لوگ اس کا ترجمہ ''تاکہ'' کرتے ہیں مگر یہ لغت کے اعتبار سے ٹھیک نہیں ہے۔ لَعَلَّ کا لفظ عربی میں امید، توقع اندیشہ اور امکان بلاوثوق کا مفہوم ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے ''تاکہ'' میں محض غرضیت کا مفہوم ہے اگر اللہ تعالیٰ کو صرف فرضیت صوم کی غرض ہی بیان کرنی ہوتو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے بجائے لِتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُتَّقِيْنَ فرمایا ہوتا۔ شاید لوگ اس موقع پر کلمہ شک کو دیکھ کر اس کی حکمت نہ سمجھ سکے۔ اس لیے انہوں نے ''لَعَلَّ'' کا ترجمہ تاکہ کر دیا تاکہ صحیح ترجمہ سے جو بات بنتی نظر نہ آتی تھی وہ غلط ترجمہ سے بن جائے۔

تعمیر سیرت

یہ تقویٰ ہی دراصل اسلامی سیرت کی جان ہے۔ جس نوعیت کا کیرکٹر اسلام ہر مسلمان فرد میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کا اساسی تصور اسی تقویٰ کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل اس لفظ کا مفہوم بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص طرز کی شکل وضع بنالینا، چند مشہور نمایاں گناہوں سے بچنا اور بعض ایسے مکروہات سے پرہیز کرنا، جنہوں نے عوام کی نگاہ میں اہمیت اختیار کرلی ہے بس اسی کا نام تقویٰ ہے حالانکہ دراصل یہ ایک نہایت وسیع اصطلاح ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ قرآن مجید انسانی طرز خیال وطرز عمل کو اصولی حیثیت سے دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتا ہے:

ایک قسم وہ ہے جس میں انسان:

(۱) دنیوی طاقتوں کے ماسوا کسی بالاتر اقتدار کو اپنے اوپر نگراں نہیں سمجھتا اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے کسی فوق البشر حاکم کے سامنے جواب دہی نہیں کرنی ہے۔

(۲) دنیوی زندگی ہی کو زندگی، دنیوی فائدے ہی کو فائدہ اور دنیوی نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے۔ اور اسی بنا پر کسی طریقہ کو اختیار کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ صرف دنیوی فائدے اور نقصان ہی کے لحاظ سے کرتا ہے۔

(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی فضائل کو بے وقعت سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کے مقابلہ میں اخلاقی و روحانی نقصان کو ہلکا خیال کرتا ہے۔

(۴) کسی مستقل اخلاقی دستور کی پابندی نہیں کرتا بلکہ موقع ومحل (CIRCUMSTANCES) کے لحاظ سے خود ہی اخلاقی اصول وضع کرتا ہے اور دوسرے موقع پر خود ہی ان کو بدل دیتا ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں انسان:

(۱) اپنے آپ کو ایسے بالاتر حکمراں کا تابع اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے، جو عالم الغیب والشہادہ ہے اور یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرتا ہے کہ اسے اپنی دنیوی زندگی کے پورے کارنامے کا حساب اس حاکم کو دینا ہے۔

(۲) دنیوی زندگی کو اصل حیات انسانی کا صرف ایک ابتدائی مرحلہ سمجھتا ہے اور ان فوائد ونقصانات کو جو اس مرحلہ میں ظاہر ہوتے ہیں، عارضی اور دھوکہ دینے والے نتائج خیال کرتا ہے اور اپنے طرز عمل کا فیصلہ ان مستقل فائدوں اور نقصانات کی بنیاد پر کرتا ہے جو آخرت کی پائیدار زندگی میں ظاہر ہوں گے۔

(۳) مادی فائدوں کے مقابلہ میں اخلاقی وروحانی فضائل کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے اور مادی نقصانات کی بہ نسبت اخلاقی وروحانی نقصانات کو شدید تر خیال کرتا ہے۔

(۴) ایک ایسے مستقل اخلاقی دستور کی پابندی کرتا ہے جس میں اپنی اغراض ومصالح کے لحاظ سے اس کو ترمیم وتنسیخ کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی قسم کے طرز خیال وطرز عمل کا جامع نام قرآن نے ''فجور[1]'' رکھا ہے اور دوسرے طرز خیال وطرز عمل کو وہ ''تقویٰ[2]'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ دراصل زندگی کے دو مختلف راستے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں اور اپنے نقطۂ آغاز سے لے کر نقطۂ انجام تک کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ فجور کے راستے کو اختیار کر کے آدمی کی پوری زندگی اپنے تمام اجزا اور تمام شعبوں کے ساتھ ایک خاص ڈھنگ پر لگ جاتی ہے جس میں تقوے کی ظاہری اشکال تو کہیں نظر آسکتی ہیں۔ مگر تقوے کی اسپرٹ کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فجور کے تمام فکری اجزا ایک دوسرے کے ساتھ منطقی ربط رکھتے ہیں اور تقوے کے فکری اجزا میں سے کسی چیز کو بھی ان کے مربوط نظام میں راہ نہیں مل سکتی۔ برعکس اس کے تقوے کا راستہ اختیار کر کے انسان کی پوری زندگی کا ڈھنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے ہی طرز پر سوچتا ہے۔ دنیا کے ہر معاملہ اور ہر مسئلہ کو ایک دوسری ہی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر موقع ومحل پر ایک دوسرا ہی طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ ان دونوں راستوں کا فرق صرف انفرادی زندگی ہی سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اجتماعی زندگی سے بھی اس کا اتنا ہی تعلق ہے جو جماعت فاجر افراد پر مشتمل ہوگی یا جس میں فاجرین کی اکثریت ہوگی اور اہل فجور کے ہاتھ میں جس کی قیادت ہوگی اس کا پورا تمدن فاجرانہ ہوگا۔ اس کی معاشرت میں، اس کے اخلاقیات میں، اس کے بین الاقوامی رویہ میں، غرض اس کی ہر چیز میں فجور کی روح کارفرما ہوگی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس کے اکثر یا بعض افراد ذاتی خودغرضیوں اور منفعت پرستیوں سے بالاتر نظر آئیں۔ مگر زیادہ سے زیادہ جس بلندی پر وہ چڑھ سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس قوم کے مفاد میں گم کر دیں جس کی ترقی سے ان کی اپنی ترقی اور جس کے تنزل سے ان کا اپنا تنزل وابستہ ہے لہٰذا اگر شخصی صورت میں فجور کا رنگ کم بھی ہو تو اس سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا۔ قومی رویہ بہرحال افادیت، ابن الوقتی، مصلحت پرستی اور مادہ پرستی ہی کے اصولوں پر چلے گا۔ اسی طرح تقویٰ بھی محض انفرادی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی جماعت متقین پر مشتمل ہوتی ہے یا اس میں

---

[1] آج کل اصطلاحوں میں ہم اسے مادہ پرستی (MATERIALISM)، افادیت (UTILITARIANISM)، مصلحت پرستی (PRAGMATISM) اور ابن الوقتی (OPPORTUNISM) کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔

[2] مغربی ذہن چونکہ اس طرز خیال سے بڑی حد تک بیگانہ ہے اس لیے جدید زمانہ کی اصطلاحوں میں ایسے الفاظ مشکل سے مل سکیں گے، جو تقویٰ کے مفہوم کو ادا کر سکیں۔ انگریزی لفظ PIETY کو پاپاؤں اور پادریوں نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ اسے استعمال کیا جا سکے نیز اس میں وہ وسعت بھی نہیں ہے جو تقویٰ میں ہے۔

اہل تقویٰ کی کثرت ہوتی ہے اور متقی ہی ان کے رہنما ہوتے ہیں تو اس کے پورے اجتماعی رویہ میں ہر حیثیت سے خدا ترسی کا رنگ ہوتا ہے، وہ وقتی اور ہنگامی مصلحتوں کے لحاظ سے اپنا طرز عمل مقرر نہیں کرتی۔ بلکہ ایک مستقل دستور کی پیروی کرتی ہے اور ایک اٹل نصب العین کے لیے اپنی تمام مساعی وقف کر دیتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ دنیوی لحاظ سے قوم کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے یا کیا نقصان پہنچتا ہے۔ وہ مادی فائدوں کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ پائدار اخلاقی و روحانی منافع کو اپنا مطمح نظر بناتی ہے۔ وہ مواقع کے لحاظ سے اصول توڑتی اور بناتی نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اصول حق کا اتباع کرتی ہے کیونکہ اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے مد مقابل قوموں کی طاقت کم ہے یا زیادہ۔ بلکہ اوپر جو خدا موجود ہے وہ اس سے ڈرتی ہے اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کا جو وقت بہر حال آنا ہے اس کی فکر اسے کھائے جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک دنیا میں فساد کی جڑ اور انسانیت کی تباہی و بربادی کا اصل سبب ''فجور'' ہے۔ وہ اس فجور کے سانپ کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے یا کم سے کم اس کے زہریلے دانت توڑ دینا چاہتا ہے تاکہ اگر یہ سانپ جیتا رہے تب بھی انسانیت کو ڈسنے کی طاقت اس میں باقی نہ رہے۔ اس کام کے لیے وہ نوع انسانی میں سے ان لوگوں کو چن چن کر نکالنا اور اپنی پارٹی میں بھرتی کرنا چاہتا ہے جو متقیانہ رجحان طبع رکھتے ہوں۔ فجور کی جانب ذہنی رجحان (BENT OF MIND) رکھنے والے لوگ اس کے کسی کام کے نہیں خواہ وہ اتفاق سے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا کیے گئے ہوں اور مسلم قوم کے درد میں کتنے ہی تڑپتے ہوں۔ اسے دراصل ضرورت ان لوگوں کی ہے جن میں خود اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جو آپ اپنا حساب لینے والے ہوں جو خود اپنے دل کی نیتوں اور ارادوں پر نظر رکھیں جن کو قانون کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کی حاجت نہ ہو بلکہ خود ان کے باطن میں ایک محاسب اور آمر بیٹھا ہو جو انہیں اندر سے قانون کا پابند بناتا ہو اور ایسی قانون شکنی پر بھی روکتا ٹوکتا ہو، جس کا علم کسی پولیس، کسی عدالت اور کسی رائے عامہ کو نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسے افراد چاہتا ہے جنہیں یقین ہو کہ ایک آنکھ ہر حال میں انہیں دیکھ رہی ہے، جنہیں خوف ہو کہ ایک عدالت کے سامنے بہر حال انہیں جانا ہے جو دنیوی منافع کے بندے، ہنگامی مصالح کے غلام اور شخصی یا قومی اغراض کے پرستار نہ ہوں۔ جن کی نظر آخرت کے اصلی و حقیقی نتائج پر جمی ہوئی ہو، جن کو دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے کا لالچ یا سخت سے سخت نقصان کا خوف بھی خداوند عالم کے دیے

ہوئے نصب العین اور اس کے بتائے ہوئے اصول اخلاق سے نہ ہٹا سکتا ہو۔ جن کی تمام سعی و کوشش صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، جنہیں اس امر کا پختہ یقین ہو کہ پایان کار بندگی حق ہی کا نتیجہ بہتر اور بندگی باطل ہی کا انجام برا ہوگا۔ چاہے اس دنیا میں معاملہ برعکس ہو۔ پھر اس کو جن آدمیوں کی تلاش ہے وہ ایسے آدمی ہیں جن کے اندر اتنا صبر موجود ہو کہ ایک صحیح اور بلند نصب العین کے لیے برسوں بلکہ ساری عمر لگاتار سعی بے حاصل کر سکتے ہوں۔ جن میں اتنی ثابت قدمی ہو کہ غلط راستوں کی آسانیاں، فائدے اور لطف و لذت کوئی چیز بھی ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکتی ہو۔ جن میں اتنا تحمل ہو کہ حق کے راستے پر چلنے میں خواہ کسی قدر ناکامیوں، مشکلات، خطرات، مصائب اور شدائد کا سامنا ہو، ان کا قدم نہ ڈگمگائے، جن میں اتنی یکسوئی ہو کہ ہر قسم کی عارضی اور ہنگامی مصلحتوں سے نگاہ پھیر کر اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جائیں، جن میں اتنا توکل موجود ہو کہ حق پرستی و حق کوشی کے دیر طلب اور دور رس نتائج کے لیے خداوند عالم پر بھروسہ کر سکیں، خواہ دنیا کی زندگی میں اس کام کے نتائج سرے سے برآمد ہوتے نظر ہی نہ آئیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو کام اسلام اپنی پارٹی سے لینا چاہتا ہے اس کے لیے ایسے ہی قابل اعتماد کارکنوں کی ضرورت ہے۔

تقوے کی اس صفت کا ہیولیٰ (ابتدائی جوہر) جن لوگوں میں موجود ہو ان کے اندر اس صفت کو نشو و نما دینے اور مستحکم کرنے کے لیے روزے سے زیادہ طاقت ور اور کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روزے کے ضابطے پر ایک نگاہ ڈالیے آپ پر خود منکشف ہونے لگے گا کہ یہ چیز کس قدر مکمل طریقہ سے ان صفات کو بالیدگی اور پائیداری بخشتی ہے۔ ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ روزہ خدا نے تم پر فرض کیا ہے۔ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ پیو، کوئی چیز حلق سے اتارو گے تو تمہارا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے تم نے اگر پرہیز کیا اور در پردہ کھاتے رہے تو خواہ لوگوں کے نزدیک تمہارا شمار روزہ داروں میں ہو مگر خدا کے نزدیک نہ ہوگا۔ تمہارا روزہ صحیح اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ خدا کے لیے رکھو، ورنہ دوسری غرض مثلاً صحت کی درستی یا نیک نامی کے لیے رکھو گے تو خدا کی نگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ خدا کے لیے اپنا روزہ پورا کرو گے تو اس دنیا میں کوئی انعام نہ ملے گا اور توڑ دو گے یا نہ رکھو گے تو یہاں کوئی سزا نہ دی جائے گی۔ مرنے کے بعد جب خدا کے سامنے پیش ہو گے اسی وقت انعام بھی ملے گا اور اسی وقت سزا بھی دی جائے گی۔ یہ چند ہدایات دے کر آدمی کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کوئی سپاہی، کوئی ہرکارہ کوئی سی آئی ڈی کا آدمی اس پر

مقرر نہیں کیا جاتا کہ ہر وقت اس کی نگرانی کرے۔ زیادہ سے زیادہ رائے عامہ اپنے دباؤ سے اس کو اس حد تک مجبور کر سکتی ہے کہ دوسروں کے سامنے کچھ نہ کھائے پیے۔ مگر چوری چھپے کھانے پینے سے اس کو روکنے والا کوئی نہیں اور اس بات کا حساب لینا تو کسی رائے عامہ یا کسی حکومت کے بس ہی میں نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کی نیت سے روزہ رکھ رہا ہے یا کسی اور نیت سے۔ ایسی حالت میں جو شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے غور کیجئے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں۔

(۱) اس کو خداوند عالم کی ہستی کا، اس کے عالم الغیب ہونے کا، اس کے قادر مطلق ہونے کا، اور اس کے سامنے اپنے محکوم اور جواب دہ ہونے کا کامل یقین ہے اور اس پوری مدت میں جب کہ وہ روزے سے رہا ہے اس کے یقین میں ذرا تنزل نہیں آیا۔

(۲) اس کو آخرت پر، اس کے حساب کتاب پر، اس کی جزا سزا پر پورا یقین ہے اور یہ یقین بھی کم از کم ان بارہ چودہ گھنٹوں میں برابر غیر متزلزل رہا ہے جبکہ وہ اپنے روزے کی شرائط پر قائم رہا۔

(۳) اس کے اندر خود اپنے فرض کا احساس ہے، وہ آپ اپنی ذمہ داری کو سمجھتا ہے، وہ اپنی نیت کا خود محتسب ہے۔ اپنے دل کے حال پر خود نگرانی کرتا ہے۔ خارج میں قانون شکنی یا گناہ کا صدور ہونے سے پہلے جب نفس کی اندرونی تہوں میں اس کی خواہش پیدا ہوتی ہے اسی وقت وہ اپنی قوت ارادی سے اس کا استیصال کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پابندی قانون کے لیے خارج میں کسی دباؤ کا محتاج نہیں ہے۔

(۴) مادیت اور اخلاق و روحانیت کے درمیان انتخاب کا جب موقع دیا گیا تو اس نے اخلاق و روحانیت کا انتخاب کیا۔ دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان و تکلیف کو اس نے گوارا کیا اور آخرت کے نفع کی خاطر دنیوی مضرت کو قبول کیا۔

(۵) وہ اپنے آپ کو کسی معاملہ میں آزاد نہیں سمجھتا کہ اپنی سہولت دیکھ کر اچھے موسم، مناسب وقت اور ٹھنڈے زمانہ میں روزہ رکھے بلکہ جو وقت قانون میں مقرر کیا گیا ہے اسی وقت روزہ رکھنے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے خواہ موسم کیسا ہی سخت ہو، حالات کیسے ہی ناموافق ہوں، اور اس کی ذاتی مصلحتوں کے لحاظ سے اس وقت روزہ رکھنا کتنا ہی نقصان دہ ہو۔

(۶) اس میں احساس ذمہ داری، تحمل، یکسوئی، توکل اور دنیوی ترغیبات وتحریصات کے مقابلہ کی طاقت کم از کم اس حد تک موجود ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کیا گیا ہے۔ اس کام کے دوران میں وہ رضا کارانہ اپنی خواہشات نفس کو روکتا ہے۔ سخت گرمی کی حالت میں پیاس سے حلق چٹخا جارہا ہے۔ برفاب سامنے موجود ہے، آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا، بھوک کے مارے جان پر بن رہی ہے، کھانا حاضر ہے، چاہے تو کھا سکتا ہے مگر نہیں کھاتا، جوان میاں بیوی ہیں، خواہش نفس زور کرتی ہے، چاہیں تو اس طرح قضائے شہوت کر سکتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے مگر نہیں کرتے، ممکن الحصول فائدوں سے یہ صرف نظر اور ممکن الاحتراز نقصانات سے پرہیز اور خود اپنے منتخب کیے ہوئے طریق حق پر یہ ثابت قدمی کسی ایسے نفع کی امید پر نہیں ہے جو اس دنیا ہی میں حاصل ہونے والا ہو، بلکہ ایسے مقصد کے لیے ہے جس کے متعلق پہلے ہی نوٹس دے دیا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے اس کے حاصل ہونے کی امید ہی نہ رکھو۔

یہ کیفیات ہیں جو پہلے روزہ کا ارادہ کرتے ہی انسان کے نفس میں ابھرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ جب وہ عملاً روزہ رکھتا ہے تو یہ بالفعل ایک طاقت بن جاتی ہیں۔ جب تیس دن تک وہ اسی فعل کی تکرار کرتا ہے تو یہ طاقت راسخ ہوتی چلی جاتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد سے مرتے دم تک تمام عمر ایسے ہی تیس تیس روزے ہر سال رکھنے سے وہ آدمی کی جبلت میں پیوست ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ یہ صفات صرف روزے ہی رکھنے میں اور صرف رمضان ہی کے مہینے میں کام آئیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان ہی اجزاء سے انسان کی سیرت کا خمیر بنے، وہ فجور سے یکسر خالی ہو اور اس کی ساری زندگی تقوے کے راستے پر پڑ جائے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے روزے سے بہتر کوئی طریق تربیت ممکن ہے؟ کیا اس کے بجائے اسلامی طرز کی سیرت بنانے کے لیے کوئی دوسرا کورس تجویز کیا جا سکتا ہے؟

ضبط نفس

اس تربیت کے ضابطے میں کسنے کے لیے صرف دو خواہشوں کو منتخب کیا گیا ہے، یعنی شہوت شکم اور شہوت فرج، اور ان کے ساتھ ایک تیسری خواہش، آرام لینے کی خواہش بھی زد میں آ گئی ہے۔ کیونکہ تراویح کے قیام اور سحری کے لیے آخری شب میں مزے کی نیند توڑ کر اٹھنے کی

وجہ سے اس پر بھی اچھی خاصی ضرب پڑتی ہے۔

حیوانی زندگی کے مطالبات میں تین مطالبے اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں:

(۱) بقائے نفس کے لیے غذا کا مطالبہ۔

(۲) بقائے نوع کے لے صنف مقابل سے اتصال کا مطالبہ۔

(۳) اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں کو بحال کرنے کے لیے آرام کا مطالبہ۔

ان ہی تین ضرورتوں کا تقاضا تمام حیوانی خواہشات کا مبدا اور تمام حیوانی اعمال کا محرک ہے اور یہ تقاضا اتنا طاقت ور ہے کہ حیوان جو کچھ کرتا ہے اسی کے زور سے مجبور ہو کر کرتا ہے۔

انسان کی خدمت گار اور آلۂ کار کی حیثیت سے جو بہترین ساخت کا حیوان (جسم) دیا گیا ہے اس کے بنیادی مطالبات بھی یہی تین ہیں اور چونکہ وہ تمام حیوانات سے اونچی قسم کا حیوان ہے اس لیے اس کے مطالبات بھی ان سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہ صرف زندہ رہنے کے لیے غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اچھی غذا مانگتا ہے، طرح طرح کی مزیدار غذائیں مانگتا ہے، غذائی مواد کی نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتا ہے اور اس کے اس مطالبہ میں اتنی شاخیں نکلتی چلی جاتی ہیں کہ اسے پورا کرنے کے لیے ایک دنیا درکار ہوتی ہے۔ وہ صرف بقائے نوع کے لیے صنف مقابل سے اتصال ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس مطالبہ میں ہزار نزاکتیں اور باریکیاں پیدا کرتا ہے، تنوع چاہتا ہے، آرائش کے بے شمار سامان چاہتا ہے، حسن چاہتا ہے، طرب انگیز سماں اور لذت انگیز ماحول چاہتا ہے غرض اس سلسلہ میں بھی اس کے مطالبات اتنی شاخیں نکالتے ہیں کہ کہیں جا کر ان کا سلسلہ رکتا ہی نہیں۔ اسی طرح اس کی آرام طلبی بھی عام حیوانات کے مثل صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے کی حد تک نہیں رہتی، بلکہ وہ بھی بے شمار شاخیں نکالتی ہے جن کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ وہ صرف کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال ہی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ حتی الامکان قوتیں کھونے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ مشقت سے جی چراتا ہے، محنت کے بغیر کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے، طرح طرح کی تدبیریں اس غرض کے لیے نکالتا ہے کہ بلا محنت یا کم سے کم محنت سے مقصد براری ہو جائے اور خصوصاً ایسے مقاصد کے لیے محنت کرنے میں تو اس کی جان پر بنتی ہے جو اس کے حیوانی مقاصد سے بالاتر ہوں۔ اس طرح ان تینوں ابتدائی خواہشوں سے خواہشات کا ایک لامتناہی جال بن جاتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا ہے۔

پس دراصل انسان کے اس خادم، اس منہ زور حیوان کے پاس یہی تین ہتھیار وہ سب سے بڑے ہتھیار ہیں جن کی طاقت سے وہ انسان کا خادم بننے کے بجائے خود انسان کو اپنا خادم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہمیشہ زور لگاتا رہتا ہے کہ اس کے اور انسان کے تعلق کی نوعیت صحیح فطری نوعیت کے برعکس ہو جائے۔ یعنی بجائے اس کے کہ انسان اس پر سوار ہو، الٹا وہ انسان پر سوار ہو کر اسے اپنی خواہشات کے مطابق کھینچے کھینچے پھرے۔ اگر انسان پوری قوت سے اس پر اپنا اقتدار مسلط نہ کرے۔ اور تمیز دار ارادہ کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دے تو بالآخر وہ اس پر غالب آجاتا ہے پھر وہ اپنے خدمت گار کا غلام اور اس کا خدمت گار اس کا آقا ہوتا ہے۔ علم اسماء کی جو نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کو دی ہے فکر و استدلال اور تسخیر و ایجاد کی جو قابلیتیں اسے عطا کی ہیں وہ سب کی سب اس اندھے، جاہل نادان جانور کی خدمت میں لگ جاتی ہیں۔ بلندیوں پر اڑنے کے بجائے پستیوں میں اترنے کے کام آتی ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانی مقاصد کی جگہ ذلیل حیوانی مقاصد حاصل کرنے کا آلہ بن جاتی ہیں۔ ان کا کوئی مصرف اس کے سوا باقی نہیں رہتا کہ رات دن بس اسی حیوان کی خواہشات پوری کرنے کے لیے نئے نئے وسائل تلاش کرتے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حیوان شر الدواب تمام حیوانات سے بدتر قسم کا حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا جس حیوان کو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے انسان جیسا خادم مل جائے اس کے شر کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے! جس بیل کی بھوک کو بحری بیڑا بنانے کی قابلیت میسر آجائے زمین کی کس چراگاہ میں اتنا بل بوتا ہے کہ اس کے معاشی مفاد کی لپیٹ میں آنے سے بچ جائے؟ جس کتے کی حرص کو ٹینک اور ہوائی جہاز بنانے کی طاقت مل جائے، کس بوٹی اور کس ہڈی کا یارا ہے کہ اس کی کچلیوں کی گرفت میں آنے سے انکار کر دے؟ جس بھیڑیے کو اپنے جنگل کے بھیڑیوں کی قومیت بنانے کا سلیقہ ہو اور جو پریس اور پروپیگنڈے سے لے کر لمبی مار کی توپوں تک سے کام لے سکتا ہو، زمین میں کہاں اتنی گنجائش ہے کہ اس کے لیے کافی شکار (LEDE NSRAUM) فراہم کر سکے؟ جس بکرے کی شہوت ناول، ڈراما، تصویر، موسیقی، رقص، ایکٹنگ اور حسن افزائی کے وسائل ایجاد کر سکتی ہو، جس میں بکریوں کی تربیت کے لیے کالج، کلب، فلمستان تک پیدا کرنے کی لیاقت ہو اس کی داد عیش کے لیے کون حد و انتہا مقرر کرنے کا ذمہ لے سکتا ہے؟

ان پستیوں میں گرنے سے انسان کو بچانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس

کے سامنے انسانی زندگی کا اصل نصب العین پیش کیا جائے اور اسے انسانی قوتوں کا صحیح مصرف بتایا جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس حیوان کے ساتھ اس کے تعلق کی جو فطری نوعیت ہے اس کو عملاً قائم کیا جائے اور مشق وتمرین کے ذریعہ سے سوار کو اتنا چست کر دیا جائے کہ وہ اپنی سواری پر جم کر بیٹھے، ارادے کی باگیں مضبوطی کے ساتھ تھامے اور اس پر اتنا قابو یافتہ ہو کہ اس کی خواہشات کے پیچھے خود نہ چلے بلکہ اپنے ارادے کے مطابق اسے سیدھا چلائے اس حیوان کو خدا نے اس لیے ہمارے سپرد کیا ہے کہ ہم اس سے کام لیں اور اس کو اپنی زندگی کے مقصد تک پہنچنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس کا دماغ ہمارے لیے فکر کرنے کا وسیلہ ہے، اس کے آلاتِ حواس ہمارے لیے علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہمارے لیے سعی وعمل کرنے کے آلات ہیں۔ جتنی چیزیں اللہ نے اس دنیا میں ہمارے لیے مسخر کی ہیں ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی حیوانی جسم ہے۔ اس کے اندر جتنی فطری خواہشات ہیں وہ سب اس کی حقیقی ضرورتوں سے تعلق رکھتی ہیں، جن کو پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم پر اس کا حق ہے کہ اسے آرام سے رکھیں، اس کو قوت بخش غذا دیں، بقائے نوع کے لیے اس کی طلب کو پورا کر دیں اور اسے خواہ مخواہ ضائع نہ کر دیں۔ لیکن بہر حال یہ ہماری اور ہمارے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے ہے نہ کہ ہم اس کی اور اس کے مقصد زندگی کی خدمت کے لیے۔ اس کو ہمارے ارادے کا تابع ہونا چاہیے نہ کہ ہمیں اس کی خواہشات کا تابع۔ اس کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ ایک فرماں روا کی طرح اپنی خواہشات ہم سے پوری کرائے بلکہ اس کا صحیح مرتبہ یہ ہے کہ ایک غلام کی طرح ہمارے سامنے اپنی خواہشات پیش کرے اور یہ ہماری باتمیز تربیت یافتہ خودی کا کام ہے کہ اس کی جس درخواست کو جب اور جس طرح مناسب سمجھیں پورا کریں یا رد کر دیں۔

روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر یہی اقتدار بخشنا ہے۔ جو تین خواہشیں تمام حیوانی خواہشات کا مبدا ہیں، جو تین ہتھیار اس حیوان کے پاس ایسے طاقت ور ہیں کہ ان کے زور سے یہ ہمیں اپنا مطیع بنانے کے لیے اٹھتا ہے۔ روزہ، انہیں تینوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس کے منہ میں مضبوط لگام لگا کر اس کی راسیں ہماری اس خودی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جو خدا پر ایمان لائی ہے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عزم کر چکی ہے۔ اس وقت اس جانور کی بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک یہ

دانا پانی مانگتا رہتا ہے اور ہم اس کو کچھ نہیں دیتے، یہ پانی کی طرف لپکنا چاہتا ہے مگر ہم باگیں کھینچ لیتے ہیں، یہ کھانا دیکھ کر اس پر منہ مارنا چاہتا ہے مگر ہم اسے جنبش نہیں کرنے دیتے۔ یہ کہتا ہے اچھا سگریٹ، حقہ پان، کسی چیز سے تو مجھے اپنی آگ بجھا لینے دو، مگر ہم اس کی ہر درخواست رد کر دیتے ہیں، یہ اپنے جوڑے دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے اور ملاعبت شروع کر دیتا ہے مگر جہاں تسکین نفس کا سوال بیچ میں آیا اور ہم نے لگام کھینچ لی۔ اس طرح دن بھر اس کی خواہشوں کو ٹھکرانے کے بعد ہم اپنے مالک کے مقرر کیے ہوئے وقت پر سے چارہ پانی دیتے ہیں۔ اب یہ تھکا ہارا چاہتا ہے کہ ذرا آرام لے، مگر عشاء کی اذان سنتے ہی ہم کان پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کرتے ہیں اور مسجد کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ دوسرے دنوں میں تو اسے عشاء کے وقت تھوڑا ہی قیام کرنا پڑتا تھا مگر رمضان میں معمولی نماز کے علاوہ تراویح کی غیر معمولی رکعتوں کے لیے بھی ہم اسے کھڑا رکھتے ہیں۔ اس رگید سے نکل کر بے چارہ سونے کے لیے دوڑتا ہے کہ بس صبح کی خبر لائے مگر رات کے پچھلے پہر میں جب کہ اس کا رواں رواں میٹھی نیند میں سرشار ہوتا ہے ہم ایک چابک ایسا رسید کرتے ہیں کہ سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے مالک کا حکم دن کے بجائے اس وقت دانہ پانی دینے کا ہے لہٰذا جو کچھ کھانا چاہتا ہے کھالے۔

یہ مشق ہے جو ہمیں ہر سال تیس دن کرائی جاتی ہے تاکہ اپنے اس خادم پر ہمیں پورا اقتدار حاصل ہو جائے۔ اس سے ہم اپنے جسم اور جسمانی قوتوں کے بااختیار حاکم بن جاتے ہیں۔ حیوانی خواہشات کی جابرانہ قہرمانی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی جس خواہش کو جس حد پر چاہیں روک دیں۔ اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں۔ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت ہی نہ رہی ہو، جو نفس کے ہر مطالبہ پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو اور جس کے لیے حیوانی جبلت کا ہر داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہے، دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑے درجہ کے کام انجام دینے کے لیے بہرحال آدمی کی خودی میں اتنا بل ہونا چاہیے کہ وہ نفس کی خواہشات کو اپنے قابو میں رکھ سکے اور ان قوتوں کو جو اللہ نے اس کے نفس و جسم میں ودیعت کی ہیں اپنے ارادے کے مطابق استعمال کر سکے۔ اسی لیے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ سال کے دوران میں کبھی کبھی نفل روزے بھی رکھنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے تاکہ اس اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی رہے۔ لیکن بہت فرق۔ اصولی اور جوہری فرق ہے۔ اس اقتدار میں جو اسلامی روزہ

انسان کی خودی کو اس کے نفس و جسم پر دیتا ہے اور اس اقتدار میں جو غیر اسلامی طرز پر نفس کشی کی مشقتوں یا قوت ارادی کی نشو ونما دینے کی ورزشوں سے حاصل کیا جاتا ہے یا جو فطری طور پر بڑے آدمیوں کو خود بخود حاصل ہوتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایک ایسی جاہل مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع، کسی ضابطہ وقانون کی پابند اور کسی علم کی متبع نہیں ہے۔ اس کو اپنی جسمانی اور نفسانی قوتوں پر فرماں روائی ہوتی ہے۔ لازم نہیں، بلکہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صحیح طریقہ پر استعمال کرے۔ دنیا میں رہبانیت اور ترک لذت کی بیماریاں اسی نوعیت کے اقتدار سے پیدا ہوئی ہیں۔ اسی اقتدار کی بدولت نفس اور جسم کے جائز حقوق چھینے گئے ہیں۔ اسی اقتدار کے بل پر انسان خود اپنی فطرت سے لڑا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت انسان نے اپنی قابلیتوں کو تہذیب وتمدن کے ارتقاء میں صرف کرنے کے بجائے تنزل وانحطاط کی کوششوں میں صرف کیا ہے۔ اسی اقتدار کی بدولت دنیا کے بہت سے بڑے آدمیوں نے خدا کے بندوں پر اپنی خدائی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی طاقتوں کو حق کے بجائے ظلم کی راہ میں استعمال کیا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی روزہ جس خودی کو نفس وجسم پر اقتدار دیتا ہے، وہ مطلق العنان خودی نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ وہ جاہل خودی نہیں ہے جو آپ اپنی رہنما ہو بلکہ ایسی خودی ہے، جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت العلم، کتاب منیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وہ خدا کے دیے ہوئے نفس وجسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی کہ اس پر قابو پا کر اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح چاہے حکمرانی کرے، بلکہ وہ اسے خدا کی امانت سمجھتی ہے اور اس امانت پر خدا کے منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایک مومن ومتقی انسان جس کی خودی اللہ تعالیٰ کی رضا کے آگے سپر ڈال چکی ہو۔ دنیا کی کسی چیز پر بھی ظلم نہیں کرسکتا۔ کجا کہ خود اپنے جسم کا حق مارے اور اپنے اس رفیق پر ظلم کرے جس کو اللہ نے مدت العمر کے لیے اس کا بہترین مددگار بنایا ہے۔ وہ اس کو اچھے سے اچھا کھلائے گا، اچھے سے اچھا پہنائے گا، بہتر سے بہتر مکان میں رکھے گا، زیادہ سے زیادہ آرام دے گا، اس کے ہر فطری جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے گا۔ نہ اس لیے کہ اس کا نفس یہ چاہتا ہے بلکہ اس لیے کہ خدا نے اس کا حق مقرر کیا ہے اور اس حق کو ادا کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب[1] ہے۔ البتہ وہی نفس

---

[1] اسی بنا پر نبیؐ نے فرمایا کہ پہلے اپنے نفس پر صدقہ کرو پھر اپنے اہل وعیال پر پھر دوسرے لوگوں پر۔ اپنے نفس پر صدقہ کرنا یا اہل وعیال پر صدقہ کرنا ایک عجیب سا تخیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اسلام کا انداز فکر کچھ ہے ہی نرالا۔ یہاں جو شخص اپنی خواہش نفس سے کھاتا ہے تو وہ بس کھا لیتا ہے مگر جو خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق سمجھ کر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جب اچھا کھانے کے لیے حرام غذا یا حرام کمائی کا تقاضا کرے گا۔ جب اچھے لباس، اچھی سواری، اچھے مکان کے لیے ایسی تدبیریں اختیار کرنے کا مطالبہ کرے گا جنہیں اللہ نے پسند نہیں کیا ہے جب وہ اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کے لیے ایسے دروازے کھولنا چاہے گا جنہیں اللہ نے بند کیا ہے۔ جب وہ اپنی آرام طلبی کے لیے ان فریضوں اور خدمتوں کو ادا کرنے سے جی چرائے گا جو اللہ نے اس پر عائد کیے ہیں۔ اور جب وہ اس جگہ اپنی خواہشات اور خود اپنی قربانی دینے سے رکنا چاہے گا جہاں اللہ کی رضا ہے کہ اسے اور اس کی خواہشوں کو قربان کر دیا جائے، وہاں مومن کی خودی اپنے حاکمانہ اختیارات کو پوری شدت کے ساتھ استعمال کرے گی اور پھر اس کو سرکشی و نافرمانی کے راستہ سے ہٹا کر فرمانبرداری کے سیدھے راستے پر لے جائے گی۔ اسی چیز کی مشق مومن سے رمضان میں کرائی جاتی ہے تاکہ دنیا کی اس امتحان گاہ میں نازک مواقع جب پیش آئیں اور وہ ہر روز ہر وقت پیش آتے ہیں تو اس کے ارادے کی باگیں اس منہ زور حیوان کو قابو میں رکھنے سے عاجز نہ رہ جائیں۔

انفرادی تربیت کا اجمالی نقشہ

یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق افراد کی تربیت سے تھا اب روزے کے اجتماعی پہلو کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ایک مجموعی نظر انفرادی تربیت کے اس پروگرام پر ڈال لیجئے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، اسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اصول وضع کرنے اور ان اصولوں کی پابندی کا ایک نظام تمدن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی) جن افراد پر مشتمل ہو ان میں ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت

(بقیہ گزشتہ صفحہ کا) اپنی حلال کمائی سے اپنے جسم کو غذا دیتا ہے اور اپنے بچوں کو کھلاتا ہے وہ دراصل ایک ثواب کا کام کرتا ہے۔ ایک ایک لقمہ پر وہ اللہ کے ہاں اجر کا مستحق ہے۔ یہی بات ہے جس پر نبیؐ نے فرمایا کہ مومن کا حال موسیٰ کی ماں جیسا ہے جنہوں نے اپنے ہی بچے کو دودھ پلایا اور اس پر اجرت بھی پائی۔ اسی طرح مومن اپنے نفس یا اپنے بال بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے اور اس پر خدا سے اجر بھی پاتا ہے۔

کرنے کے بجائے اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) اس تربیت کے ذریعہ سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلہ میں اپنی خودمختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے تا آنکہ وہ اپنی پوری زندگی کو قانون الٰہی کے تابع کر دے۔

(۲) ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ مشق و تمرین کے ذریعہ سے اس طرح جاں گزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے قانون الٰہی کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

(۳) ہر فرد کے اندر یہ روح پھونک دی جائے کہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی سند نہ ہو اس کی اطاعت کے لیے فرد مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

(۴) ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو۔ وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے۔ اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ اور ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آ جائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد خواہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے، بیماری، سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

اگرچہ لازم نہیں کہ روزے کی تربیت سے تمام افراد کے اندر وہ خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں کیونکہ ان کی پیدائش اور تکمیل کے لیے خود تربیت

لینے والے میں ذاتی استعداد بھی ضروری ہے لیکن بجائے خود اس نظام تربیت کی فطرت میں یہ خاصہ موجود ہے کہ اس سے یہ خصوصیات انسان میں پیدا ہوں اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام تربیت تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص صداقت پسندی کی نظر سے دیکھے تو اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اجتماعی نظام ایسا نہیں ہے جس نے افراد کو تیار کرنے کا اتنا وسیع و ہمہ گیر انتظام کیا ہو کہ پوری کی پوری آبادیاں اس کے دائرہ میں آ کر خود بخود اخلاقی تربیت پاتی چلی جائیں۔

پھر اس کا مزید کمال یہ ہے کہ سوسائٹی کے حدود میں اگر کوئی فرد ایسا ناقص نکل آئے کہ اس اجتماعی نظام کا جزو بن کر نہ رہ سکتا ہو تو وہ خود بخود الگ ممتاز ہو جاتا ہے جہاں اس نے بغیر عذر شرعی کے روزہ ترک کیا اور فوراً ہی یہ بات سوسائٹی پر آشکارا ہو گئی کہ اس کے درمیان ایک ایسا شخص موجود ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتا اور اپنی حیوانی جبلت کا بندہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس صریح علامت سے سوسائٹی کو اپنے جسم میں ایک سڑے ہوئے عضو کی موجودگی کا بروقت علم ہو جاتا ہے اور اس کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے زہر سے محفوظ کر لے۔ کم از کم اسلام نے تو اپنی حد تک ایسے لوگوں کی نشان دہی کا پورا انتظام کر دیا ہے اور ہر مسلم سوسائٹی کے لیے اس بات کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ عین وقت پر ان کے وجود سے آگاہ ہو کر یا تو ان کی اصلاح کرے یا انہیں اپنے دائرہ سے خارج کر دے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بے حس نام نہاد مسلم سوسائٹی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائے اور ایسے لوگوں کو نہ صرف اپنی گود میں پرورش کرے بلکہ انہیں اپنے سر پر بٹھائے اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔

روزے کا اجتماعی پہلو

نماز کی طرح روزہ بھی بجائے خود ایک انفرادی فعل ہے لیکن جس طرح نماز کے ساتھ جماعت کی شرط لگا کر اس کو انفرادی سے اجتماعی فعل میں تبدیل کر دیا گیا ہے اسی طرح روزے کو ایک ذرا سی حکیمانہ تدبیر نے انفرادی عمل کے بجائے اجتماعی عمل بنا کر اس کے فوائد و منافع کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تدبیر بس اتنی سی ہے کہ روزے رکھنے کے لیے ایک خاص مہینہ مقرر کر دیا گیا۔ اگر شارع کے پیش نظر محض افراد کی اخلاقی تربیت ہوتی تو اس کے لیے

یہ حکم دینا کافی تھا کہ مسلمان سال بھر کے دوران میں کبھی تیس دن کے روزے رکھ لیا کرے۔ اس طرح وہ تمام مقاصد پورے ہو سکتے تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے بلکہ ضبط نفس کی مشق کے لیے یہ صورت زیادہ مناسب تھی کیونکہ اجتماعی عمل سے روزہ رکھنے میں جو آسانی افراد کے لیے پیدا ہو جاتی ہے وہ انفرادی عمل کی صورت میں نہ ہوتی اور ہر شخص کو اپنا فرض ادا کرنے میں نسبتاً زیادہ شدت کے ساتھ اپنی قوت ارادی استعمال کرنی پڑتی لیکن اسلام کا قانون جس حکیم نے بنایا ہے اس کی نگاہ میں افراد کی ایسی تیاری کسی کام کی نہیں ہے جس کے نتیجہ میں ایک جماعت صالحہ وجود میں نہ آئے اس لیے اس نے روزے کو محض ایک انفرادی عمل بنانا پسند نہیں کیا بلکہ سال بھر میں ایک مہینہ روزے کے لیے مخصوص کر دیا۔ تاکہ سب مسلمان بیک وقت روزہ رکھیں اور وہی نظام تربیت جس سے افراد تیار ہوں ایک صالح اجتماعی نظام بنانے میں بھی مددگار ہو جائے۔

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں۔

تقوے کی فضا

اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں شریک ہوں تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اس کی ذات تک محدود اور صرف اس کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی۔ اس کو نشو و نما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو، اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک شخص اکیلا برہنہ ہو اور گرد و پیش سب لوگ کپڑے پہنے ہوئے ہوں تو وہ کس قدر شرمائے گا؟ بے حیائی کی کتنی بڑی

مقدار اس کو برہنہ ہونے کے لیے درکار ہوگی؟ اور پھر بھی ماحول کے مختلف اثرات سے اس کی شدید بے حیائی بھی کس طرح بار بار شکست کھائے گی؟ لیکن جہاں ایک حمام میں سب ننگے ہوں وہاں شرم بے چاری کو پھٹکنے کا بھی موقع نہ ملے گا۔ اور ایک شخص کی بے شرمی دوسروں کی بے شرمی سے مدد پا کر افزوں در افزوں ہوتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہلک جنگ برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ مگر جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہامت وحماست کا طوفان امنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔ نیکی ہو یا بدی دونوں کی ترقی میں اجتماعی نفسیات کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ جماعت مل کر بدی کر رہی ہو تو فحش، بے حیائی اور بدکاری کے جذبات ابل پڑتے ہیں اور جماعت مل کر نیکی کر رہی ہو تو پاکیزہ خیالات اور نیک جذبات کا سیلاب آجاتا ہے جس میں بد بھی نیک بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔

اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر وصلاح اور تقویٰ وطہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں نہیں، نیکیاں پھلتی ہیں، پوری پوری آبادیوں پر خوف خدا اور حب خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیز گاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔ اس زمانہ میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے۔ ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کے لیے کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتا دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے، کسی غریب کو کھانا کھلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے، کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے، کہیں کوئی بدی ہو رہی ہے تو اسے روکے، اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں، برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ توبہ اور خشیت وانابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں، نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بدوں کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے ان کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارع نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینہ کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے، اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے، اس کی کایا پلٹی جائے اور اس مجموعی

حیثیت سے روح اسلامی کو از سر نو زندہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر نبیؐ نے فرمایا:

اذا دخل رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب جهنم وسلسلت الشيطين۔

''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیے جاتے ہیں۔''

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

اذا كان اول ليلة من شهر رمضان عقدت الشيطين و مردة الجن وغلقت ابواب النار فلم يفتح منها باب وينادى مناد يا باغى الخير اقبل و يا باغى الشر ا قصر۔

''جب رمضان کی پہلی تاریخ آتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن باندھ دیے جاتے ہیں۔ دوزخ کی طرف جانے کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا، اور جنت کی طرف جانے والے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ان میں کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اس وقت پکارنے والا پکارتا ہے، اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور برائی کے خواہش مند ٹھہر جا۔''

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح لیا گیا ہے کہ اس کی ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ سی پیدا ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے ورنہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی کسی بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے زمانہ میں دیکھو، اگر اس مہینہ میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوف خدا، کچھ نیکی کے جذبہ کا ابھار نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہیں اور اگر اس مہینہ میں بھی نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار نمایاں ہوں اور اسلامی حس مردہ نظر آئے تو ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھ لو، اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس ''مسلمان'' کے لیے مقدر نہیں ہے۔[1]

---

(۱) یہ تو ہے امتحان کا اسلامی معیار، مگر اب اس جانچ کے لیے کچھ دوسرے معیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی کوئی آبادی غلام ہو تو اس کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ قومی مفاد (یعنی قوم کے معاشی وسیاسی مفاد) کے لیے ان میں کتنی تڑپ ہے؟ اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ کہاں تک چیختے ہیں؟ اور جلسوں میں اسلام اور اسلامی قوت کا نام کس جوش وخروش سے لیا جاتا ہے؟ اور اگر وہ آبادی آزاد ہو تو اس کی زندگی کا امتحان لینے کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ (بقیہ گزشتہ صفحہ پر)

اجتماعی احساس

اجتماعی عمل کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان یا مرز بوم یا معاشی اغراض کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتا۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہو۔ یہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔

اور جس کے ساتھ خیالات اور عمل میں اتفاق نہ ہو اس سے کبھی دل نہیں ملتا خواہ دونوں ایک ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہوں۔ جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی کیفیت کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہم یگانگت، رفاقت، یکجہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ قلب و روح کا اشتراک اور عمل کا اتفاق ان کو آپس میں جوڑ کر ایک کر دیتا ہے۔

خواہ نیکی ہو یا بدی، دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتے ہیں۔ چوروں میں چوری کا اشتراک اور شرابیوں میں شراب نوشی کا اشتراک بھی یونہی برادری پیدا کرتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستہ میں افراد کی نفسانیت کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے اس لیے راستوں میں کبھی بے آلائش اور مستحکم نہیں ہوتی، بخلاف اس کے نیکی کے راستہ میں نفسانیت دبتی ہے، انسانی روح کو حقیقی تسکین ملتی ہے اور پاک جذبات کے ساتھ آدمی اس راستہ پر چلتا ہے اس لیے نیک خیالات اور نیک عمل کا اشتراک وہ بہترین رشتۂ اخوت پیدا کرتا ہے جس سے زیادہ مستحکم اجتماعی رابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز باجماعت کی طرح رمضان کے اجتماعی روزے مسلمانوں میں اسی نوع کی برادری

(بقیہ گزشتہ صفحہ کا) اس نے ہوائی جہاز کتنے مہیا کیے؟ ریلیں کتنی بنائیں؟ مدرسے اور کارخانے کس قدر قائم کیے؟ اپنی عورتوں کو بے حیائی میں کہاں تک طاق کیا ہے اور تہذیب و تمدن اور معاشرت میں یورپ سے لگا کھانے کی کہاں تک کامیاب کوشش کی، ان آزمائشوں میں اگر کوئی آبادی پوری اتر گئی تو کہا جاتا ہے کہ الحمدللہ، اسلام زندہ ہے اور بس؟ ”ہوتا ہے جادہ پیما اب کارواں ہمارا“

پیدا کرتے ہیں، تمام لوگوں کا مل کر ایک خدا کی رضا چاہنا، اسی کی رضا کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اٹھانا، اسی کے خوف سے برائیوں کو چھوڑنا اور ایک دوسرے کو برائیوں سے روکنا، اسی کی محبت میں بھلائیوں کی طرف دوڑنا اور ایک دوسرے کو بھلائی پر اکسانا، یہ چیز ان میں بہترین قسم کی وحدت، صحیح ترین فطری قومیت، پاکیزہ ترین اجتماعی ذہنیت اور ایسی ہمدردی و رفاقت پیدا کرتی ہے جو ہر کھوٹ سے خالی ہے۔

امداد باہمی کی روح

اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔ اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہ کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گزرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا چاہنے کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اخلاقی و تمدنی فوائد بے شمار ہیں۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکالیف کا احساس اور ان سے عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو، بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے محفوظ رہتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد کے بجائے محبت کا، شکر گزاری اور احسان مندی کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور وہ طبقاتی جنگ کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوموں میں ہو یا ہوتی ہے جن کے مال دار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے؟ جو قحط کے زمانہ میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں؟ انہیں روٹی نہیں ملتی تو یہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

روزہ اسلام کا دوسرا عملی رکن ہے جس کے ذریعہ سے اسلام اپنے افراد کو فرداً فرداً، ایک خاص قسم کی اخلاقی تربیت دے کر تیار کرتا ہے اور پھر انہیں جوڑ کر ایک خاص طرز کی جماعت بناتا ہے۔ اسلام کا آخری مقصد جس مدنیت صالحہ اور حکومت الٰہیہ کو وجود میں لانا ہے اس کے اجزائے ترکیبی اس طرح نماز اور روزے کے ذریعہ سے چھیل بنا کر تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے سپاہی

اور جنرل، اس کے اہل کار، عہدے دار اور وزراء، اس کے معلم اور پروفیسر، اس کے قاضی اور مفتی، اس کے تاجر اور مزدور، کارخانہ دار اور کسان، اس کے رائے دہندے، نمائندے اور شہری سب اس تربیت کے بعد کہیں اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے وہ صالح تمدنی و سیاسی نظام بن سکے جسے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ محض اَن گھڑ افراد کو لے کر خلافت الٰہیہ قائم کرنے کے لیے دوڑ جانا ایسی خام خیالی و خام کاری ہے جس سے اللہ اور اس کا رسولؐ بری ہیں۔